رجسٹرڈ نمبر ا ے ا ۱   جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

دارالمصنّفین کی تاریخی کتابیں

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے والبستہ رہے، مگر افسوس ہو کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کیگئی ہو، جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہوگئی ہو، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہو، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلاوطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہو، ضخامت مجموعی ۵۴۶ صفحے کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: للعہ، جلد دوم زیر طبع ہو، مرتبہ سید ریاست علی ندوی،

تاریخ فقہ اسلامی، مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جسمیں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہو جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہو، حجم ۴۸۰ صفحے، قیمت للعہ، مترجمہ مولٰنا عبدالسلام ندوی،

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۷ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب، قیمت: للعہ، مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی،

مقدمہ رقعات عالمگیر، اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہو جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی ہے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۴۸۰ صفحے، قیمت: صہ، مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

الفاروق یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولٰنا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہو، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہو، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت: للعہ

خلفائے راشدین، سیر المہاجرین کا حصۂ اوّل، یہ چاروں خلفاء کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۴۸۰ صفحے، قیمت: ؁، از مولٰنا حاجی معین الدین ندوی،

(دارالمصنفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۳۸	ماہ ربیع الثانی مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۶ء	عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اخبارون سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ہندوؤن نے جن مین ان کے اہل قلم اور اہل سیاست دونون شامل ہین، ایک نئی مجلس کی بنیاد اس غرض سے ڈالی ہے کہ ہندی اس ملک کی مشترک زبان قرار دیا جائے، چنانچہ پچھلے مہینہ اس کا جلسہ بہت دھوم دھام سے ناگپور مین ہوا اور یہ طے پایا کہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان "ہندی یعنی ہندوستانی" ہے،

آج تک اُس زبان کے جس کو اب غلطی سے اردو کہا جاتا ہے، دو نام تھے، ایک ہندی اور دوسرا ہندوستانی، پہلا نام مدت ہوئی کہ ناگری خط مین لکھی جانے والی بھاشا کا مشہور کیا گیا، اور اس کو یہ شہرت دی گئی کہ امتیاز کے لئے دوسری زبان کا نام اردو رکھنا پڑا، اور کبھی کبھی اس کو ہندوستانی بھی کہا جانے لگا، اور خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ نام پھیل کر اردو کے غلط نام کو مٹا دیگا، مگر ہندو مدبر یہ جانتے ہین کہ نام مین کتنی طاقت ہوتی ہے، اردو ہندوستانی بنکر ملک کی عام زبان ہونے کی سینکڑون دلیلوں کی ایک دلیل ہو جاتی، اس لئے ناگپور مین "ہندی یعنی ہندوستانی" کی عجیب و غریب تشریح سے ایک ہی حملہ مین دونون پر قبضہ جما لیا گیا،

ہم نے ہندی کے حامیون کی اس چال کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا، اور آج سے چند سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مین ایک مقالہ کے ضمن مین یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم اپنی اس زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے یاد کرین، پھر معارف مین اس کی تحریک برابر جاری رکھی اور بعض صوبون نے

اس تحریک پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، گو بعض ناعاقبت اندیش مسلمانون نے اس کی مخالفت بھی کی، لیکن غور سے دیکھئے کہ ہندو اہل نظر ہماری اس تحریک پر کتنے چوکنے ہوئے، ان کو اسکے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی بھاشا کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لقب بھی فوراً اختیار کرین،

مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو نے جو اس کانفرنس مین شریک تھے، اس کانفرنس کی روداد پر اخبارون مین بہت اچھا تبصرہ لکھا ہے، اور حقیقت بات وہی ہے جو پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) نے خط بنام گاندھی جی مین لکھی ہے، کہ ہندوستان کی عام بننے والی زبان کا معیار رواج ہو نہ کہ ہندی لغت، یہی بات ہم نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایک یادگاری مجموعۂ مضامین مین لکھی تھی،

ہندی کے حامی اس بات کے درپے ہین کہ چند سو سال پہلے ہندی کے چند شاعرون نے جس زبان مین شاعری کی اسی کو ملک کی علمی ادبی اور عام زبان قرار دین، حالانکہ انصاف یہ ہے کہ آج پشاور سے کلکتہ تک جو زبان عام طور سے بولی چالی اور سمجھی جاتی ہے، وہی ملک کی عام زبان قرار دیا جائے، مگر ہندی کے حامی ایک بات طے کر چکے ہین، اب دیکھنا ہے کہ ہندوستانی (اردو) کے حامی کیا طے کرتے ہین

ایک نکتہ ہندوستان کے مسلمانون کے غور کے قابل ہے، اس ملک کے ہندوون نے خواہ وہ اپنے سیاسی مسلکوں مین کسی قدر مختلف ہون، ایک بات قطعی طور سے طے کر لی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا قومی نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان مین ہندو تہذیب و تمدن، کلچر اور ادب بلکہ حکومت تک کو دوبارہ قائم کیا جائے، اور "ہندوستان" کو بجا طور پر "ہندو استھان" بنایا جائے، اس مقصد پر آریہ سماجی اور سناتن دھرمی مہاسبھائی اور کانگریسی، اچھوت، حضوری اور آزاد، ملازم سرکار اور غیر ملازم سبھی متفق ہین، اور قوم کا ہر فرد اور ہر کارکن اپنے اپنے راستہ سے اسی منزل مقصود کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے، سوال یہ ہے کہ اس کے مقابلہ مین مسلمانون کا قومی نصب العین کیا ہے؟ اور وہ اس کے لئے کیا کر رہے ہین

اگر برا نہ مانا جائے تو ہم بتائین، علمار نے یہ طے کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا مشغلہ جاری رکھینگے، اور عام تعلیم یافتہ سب سے پہلے نوکری، اور ان کے ممتاز افراد کونسلون کی ممبری، اور ہو سکے تو کسی نہ کسی طور سے وزارت کے حصول کی کوشش مین لگے رہین گے، اس سے آگے بڑھ کر نہ ان کا کوئی قومی نصب العین ہے اور نہ کوئی مطمح نظر ہے،

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

انہی کونسلون کی پیچ در پیچ سیاستون نے ہمارے اس اسلامی صوبہ کا کیا حال کر رکھا ہے، جس پر ہندوستان کے تمام مسلمانون کا سارا بھروسہ ہے، یعنی پنجاب، ایک فیصدی اسلامی زیادتی کے بھی بیسیون متفرق و مختلف سیاسی فرقون مین بٹ کر بیکار ہو جانے مین کوئی شک نہین رہا، اور اس پر بھی مقصد متعین نہین، اور نصب العین ایک نہین،

ایسی صورت مین مسٹر جناح کی کوشش سے ملک مین جو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا ہی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس نے اپنا جو منشورِ عمل (مینی فسٹو) شائع کیا ہے، اور مختلف الخیال مسلمانون کو چند دفعات پر جو متفق کیا ہے، وہ بہت کچھ حوصلہ افزا، اور مسلمانون کی پراگندگی کو ایک شیرازہ مین باندھنے والا ہے، گو ظاہر ہے کہ وزارت کے طلبگار اور حامی اس کا ساتھ نہ دینگے، کیونکہ اس منشورِ عمل کی کسی دفعہ مین یہ نہین بتایا گیا ہے کہ وزارت کس طرح مل سکیگی،

مقالات

جہانگیر کا علمی ذوق

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین،

جہانگیر دعاؤن سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا، اور ناز و نیاز کے ساتھ بڑھا، ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارہ میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو علم پرور باپ نے اسکے رسم مکتب کی تقریب انجام دی، اور ملک الشعرا فیضی اور مولینا میر کلان ہراتی کو اسکی تعلیم کیلئے مامور کیا، قطب الدین خان آتکہ، اور عبد الرحیم خان خانان اس کے اتالیق مقرر ہوئے، ایسے استادون اور اتالیقون کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہونا چاہئے تھا، وہ ہوا، وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بنکر چمکا،

عبد الرحیم خانخانان سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی ہے، لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہون،" تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزا ترکی زبان میں لکھکر اضافہ کئے ہیں

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشار پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علمی شاہکار خود اوسکی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی، اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے عدیل ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف، برجستہ اور دلآویز طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ بڑے بڑے انشار پرداز نہیں کر سکتے، وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیون کی تصویر کھینچتا ہے، تو ہم میدانِ کارزار میں کھڑے نظر آتے ہین، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستانِ عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو

آنکھون کے سامنے اسکی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں پھر جاتی ہین، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر نکتہ سنجی کرتا ہے تو مسئلہ کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے، تو ایک محقق جغرافیہ دان کی طرح اس کے متعلق سارے معلومات فراہم کرتا ہے، جب وہ ایک شہر کی تاریخ، اور وہان کے لوگون کے رسوم و عادات کو تحریر کرتا ہے تو وہ ایک مورخ کی شان مین نظر آتا ہے، وہ جب پھولون، پھلون، پرندون اور جانورون کی جزوی تفصیلات کو بیان کرتا ہے، تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے، یہان چند مثالیں ملاحظہ ہون،

سنہ ۱۶۱۲ء مین عثمان خان افغانی نے بنگالہ مین بغاوت کا علم بلند کیا، اس کے استیصال کے لئے جہانگیر نے شاہی لشکر بھیجا، اس جنگ کی جو قلمی تصویر اس نے کھینچی ہے، وہ یہ ہے:

"در کنار نالہ کہ زمین آن تمام چہلہ و دلدل بود، جائے جنگ قرار داد، روز یکشنبہ ۹ محرم شجاعت خان ساعت جنگ اختیار نمودہ افواج قاہرہ را مقرر ساخت کہ ہر یک بجا و مقام خود رفتہ آمادہ جنگ باشند، عثمان دران روز قرار جنگ با خود نداده بود، چون شنید کہ لشکر ہائے بادشاہی مستعد گشتہ آمدہ اند، ناچار او ہم سوار شدہ بہ کنار نالہ آمد، و سوار و پیادۂ خود را در برابر افواج منصورہ باز داشت، چون ہنگامہ جنگ گرم گشت و فوج بہ فوج رو بروئے خود متوجہ گردید، دریں مرتبہ اول آن جاہل خیرہ سر فیل مست جنگی خود را پیش انداختہ بر فوج ہراول می تازد، بعد از زد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید اعظم بارہہ و شیخ اچھے بدرجۂ شہادت می رسند، سردار برانغار افتخار خان ہم در ستیز و آویز تقصیر نکردہ جان خود را نثار می نماید، و جمعے کہ با او بودند، آنقدر تلاش می کنند، کہ پارہ پارہ می شوند، ہمچنان گروہ جرانغار کشور خان داد مردی و مردانگی دادہ، خود را فدائے کار صاحب می سازد، باآنکہ تیرہ بختان نیز بسیار زخمی و کشتہ شدہ بودند، آن مدبر حساب لشکریان را از روئے

دانستگی و فہمیدگی بخاطر می آورد، و تشخص خود می سازد کہ سرداران ہراول و برانغار و جرانغار کشتہ شدند، ہمیں قول ماندہ از کشتہ شدن و زخمی گشتن جمعیت خود پریشان، و آنکہ دہ در ہمان گرمی بر قول می تازد، و درین جانب پسر و برادران و خویشان شجاعت خان و دیگر بندہ ہا راہ بران گمراہان گرفتہ بر مثال شیران و پلنگان بہ پنجہ و دندان تلاش می کردند، چنانچہ بعضے درجۂ شہادت یافتند، و جمعی کہ زندہ ماندند زخمہائے منکر بر داشتند، دریں وقت فیل مستی گجپت نام کہ فیل اول او بودہ بر شجاعت خان می دواند شجاعت خان دست برچھہ بردہ بر فیل می زند لطور فیل مستی را از برچھہ چہ پروا است، دست بہ شمشیر بردہ دو شمشیر پے در پے می زند، از ان ہم چہ محابا بعد از ان جمدھر کشیدہ و جمدھر می رساند، بآن ہم بر نمی گردد، و شجاعت خان را با اسپ زیر می کند، بمجرد از اسپ جدا شدن، جہانگیر شاہ گفتہ بر می جہد و جلودار او شمشیر دو دستی بر دستہائے فیل رسانیدہ، چون فیل بزانو در می آید، اتفاقاً جلودار فیلبان را از بالائے فیل بزیر می کشد، و ہمان جمدھر کہ در دست داشت، دریں پیادگی بہ نوعے بر خرطوم و پیشانی فیل می زند، کہ فیل از الم آن فریاد زنان بر می گردد، چون زخمہا بسیار داشت بہ فوج خود رسیدہ می افتد و اسپ شجاعت خان سالم بر می خیزد و در حینیکہ سوار می شد، آن مخذولان فیل بر علمدار او می دوانند و علم او را با اسپ زیر می کنند و از آنجا شجاعت خان نعرۂ مردانہ بر کشیدہ علمدار را خبر می سازد و می گوید کہ مردانہ باش من زندہ ام و در پائے علم دریں وقت تنگ ہر کس از بندہ ہائے درگاہ حاضر بودند، دست بہ تیر و جمدھر و شمشیر بردہ بر فیل می دوند، و شجاعت خان ہم خود را رسانیدہ، بہ علمدار نہیب می دہد، کہ بر خیز و اسپ دیگر بجہت علمدار حاضر ساختہ، او را سوار می سازد و علمدار علم بر افراختہ بر جائے خود می ایستد در اثنائے این گیر و دار تفنگی بر پیشانی آں مقہور می رسد کہ زنندۂ آن را ہر چند تفحص کردند، ظاہر نشد بہ مجرد رسیدن ایں تفنگ از آں گرمی باز آمدہ می داند، کہ ازین زخم جان بری نیست تا دو پہر ہم

با وجود چنیں زخمی منکر مردم خود را بہ جنگ ترغیب می نمود، و معرکہ قتال و جدال گرم بود، بعد
بعد ازاں غنیم رو گردانید، و افواج قاہرہ سر در پے آنہا می نہند، و زدہ زدہ آن مخذولان
را در محلے کہ دائرہ کردہ بودند، در می آورند، آن مخذولان بہ تیر و تفنگ مردم را نگاہ
داشتہ، می گذارند کہ مردم بادشاہے بجا و مقام آنہا درآیند، چوں ولی برادر عثمان و ممریز پسر او
و دیگر خویشاں و نزدیکان او بر زخم عثمان مطلع می شوند بخاطر می گزرانند کہ ازین زخم خود
او را خلاصی میسر نیست، اگر ما ہمچنیں شکستہ و ریختہ بر قلعہ خود رویم یک کس زندہ نخواہد رسید،
صلاح درنیست کہ امشب کہ در ہمیں جا کہ دائرہ کردہ ایم بمانیم، و آخر شب فرصت
جستہ، خود را بہ قلعہ خود رسانیم، دو پہر از شب گذشتہ عثمان بجہنم واصل می گردد...... الخ[1]

وہ عیش و نشاط کی بزم کی تصویر بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ کھینچتا ہے، تخت نشینی کے بعد پہلے
نوروز کے جشن کا مرقع اس طرح سج کر تیار کرتا ہے،

شب سہ شنبہ یازدہم ذی قعدہ سنہ ۱۰۱۴ ہزار و چہاردہ صبح کہ محل فیضان نور است حضرت
نیر اعظم از برج حوت بخانہ شرف و خوش حالی خود کہ برج حمل باشد، انتقال فرمود
چون اولیں نوروز از جلوس ہمایون بود، فرمودم کہ ایوانہائے دولت خانہ خاص و عام
بدستور زمان والد بزرگوارم در اقمشہ نفیسہ گرفتہ، آئینے در غایت زیب و زینت ببندند و از
روز اول نوروز تا نوزدہم، درجۂ حمل کہ روز شرف است خلایق داد عیش و کامرانی دادند
اہل ساز و نغمہ از ہر طائفہ و ہر جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند کہ بکرشمہ
دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامۂ مجلس را گرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس کیفیات و مفرحات
انچہ می خواستہ باشند، بخورد، منع و مانعی نباشد،

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۳-۱۰۴، نولکشور پریس،

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما،
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما[1]

سن جلوس کے بارہویں سال میں شعبان کی چودھویں تاریخ کو نور جہان نے ایک مجلس جشن
ترتیب دی، اس کا حال جہانگیر اس طرح لکھتا ہے:۔

آخر ہائے روز پنجشنبہ بست و ششم موافق چہاردہم شہر شعبان کہ شب برات بود، در یکے از
منازل و عمارات محل نور جہاں بیگم کہ در میان تالابہائے کلاں واقع است مجلس جشن
نمودم، و امرا و مقربان را درین مجلس کہ ترتیب دادہ بیگم بود طلب داشتہ حکم کردم کہ بمردم
پیالہ و اقسام کیفیات بمقتضائے خواہش ہر کس بدہند، بسیارے پیالہ اختیار نمودند،
فرمودم کہ ہر کس کہ پیالہ بخورد بہ مثل منصب و حالت خود نشیند، و اقسام کبابہا و میوہا
بطریق گزک مقرر شد کہ در پیش ہر کس بنہند، عجب مجلسے منعقد گشت، در آغاز شام براطراف
تال و عمارات فانوسہا و چراغہا روشن ساختہ، چراغانے بہم دست داد کہ تا ایں رسم
را معمول ساختہ اند، شاید در ہیچ جا مثل این چراغانے نشدہ باشد، جمیع چراغہا
و فانوسہا عکس در آب انداختہ بنوعے بنظر در می آمد، کہ گویا تمام صحن این تالاب یک میدان
آتش است، بسیار شگفتہ مجلسے گذشت و پیالہ خواراں زیادہ از حوصلہ طاقت پیالہا
تناول نمودند،

دل افروز بزمے شد آراستہ — بخوبی بدانسان کہ دل خواستہ،
فگندند در پیش ایں سبزہ کاخ — بساطے چو میدان ہمت فراخ،
زبس نکہت بزم می رفت دور — فلک نافہ مشک بود از بخور،

[1] تزک جہانگیری ص ۲۳،

شدہ جلوہ گر نازنیان باغ، رُخ افروختہ ہر یکے چون چراغ[1]

وہ دقیق فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو اس سادگی، اختصار اور حسن و خوبی سے ذہن نشین کرتا ہے کہ دوسرے اہلِ قلم شاید متعدد صفحات کے سیاہ و سپید کرنے کے بعد بھی ویسی کامیابی حاصل نہین کرسکتے، وہ ہندو پنڈتون کو بتانا چاہتا ہے، کہ حق تعالیٰ کی ذاتِ مقدس، جسم و چون و چگونگی سے منزہ ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

"روزے از پنڈتاں کہ عبارت از دانایان ہنود ست پرسیدم کہ اگر منتہاے دین شما بر فرود آمدن ذاتِ مقدس حق تعالے ست در دہ پیکرِ مختلف بطریق حلول آن خود نزد اربابِ عقل مردود است وایں معتقدہ لازم دارد، کہ واجب تعالیٰ کہ مجرد از جمیع تعینات ست صاحبِ طول و عرض و عمق بودہ باشد، واگر مراد ظہور نور الٰہی است دریں اجسام آن خود در ہمہ موجودات مساوی است، وبایں دہ پیکر مختص نیست واگر مراد اثبات صفتے از صفات الٰہی ست، دریں صورت ہم تخصیص درست نہ زیرا کہ در ہر دین وآئین صاحبانِ معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردمان زمان خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت و شنود، بسیار و رد و بدل بے شمار بخدائی خداے منزہ از جسم و چون و چگون معترف گشتند و گفتند کہ چون اندیشہ ما در ادراک ذات مجرد ناقص است، بے وسیلہ صورت را بمعرفتِ او نمی بریم وایں دہ پیکر را وسیلہ شناخت و معرفت خود ساختہ ایم، پس گفتم ایں پیکر ہاے شما را وسیلہ مقصود بمعبود تواند بود؛"[2]

وہ جب پھولون کا ذکر کرنے لگتا ہے، تو نباتات کے طالب العلم اپنی واقفیت مین نئے معلومات کا بیش قیمت اضافہ کرسکتے ہین، آگرہ کے شاہی باغ گل افشان کے پھولون کا ذکر اس طرح کرتا ہی،

[1] تزک جہانگیری ص ۱۹۱، نولکشور پریس، [2] ایضاً ص ۱۵،

اول گل چنپہ گلی ست بہ نہایت خوشبوئے ولطافت بہیات گل زعفران لیکن رنگ چنپہ زرد مائل بسفیدی ست، درخت آن در غایت موزونی ست وکلان وپر برگ وشاخ وسایہ دار در ایام گل یک درخت باغے را معطر دارد، واز ان گذشتہ گل کیوڑہ ست کہ ہیئت واندام غیر مکرر است، بوئے او در تندی وتیزی بدرجہ ایست، کہ از بوے مشک ہیچ کمی ندارد، دیگر راے بیل کہ در بو از عالم یاسمن سفید است، غایتاً برگہایش دو سہ طبقہ بر روے ہم واقع شدہ، دیگر گل مولسری است، کہ درخت آن نیز بسیار خوش اندام و موزون و سایہ دار است، وبوئے گل آن در نہایت ملائمیت دیگر گل سیوتی کہ از عالم گل کیوڑہ است، غایتاً کیوڑہ خار دار است، وسیوتی خار ندارد، رنگ آن بزردی مائل است وکیوڑہ سفید رنگ ست ازیں گلہا واز گل چنبیلی کہ یاسمن سفید ولایت ست، روغنہاے خوشبو می سازند،[1]

جانورون کی تصویر جب وہ کھینچتا ہے، تو وہ اتنی صاف اور واضح ہوتی ہے، کہ علم الحیوانات کے ماہرین اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہین، ۱۰۲۱ھ مین مقرب خان کھمبایت سے ایک عجیب و غریب جانور ساتھ لایا، اوس کا بیان جہانگیر اس طرح دیتا ہے، جو انشا پردازی، اور لطافت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے،

"یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلاں تر، واز نر فی الجملہ خورد تر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید، دُم خود را و دیگر پر ہا را طاؤس آسا پریشاں می سازد، و برقص در می آید، سر و گردن و زیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد، وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ است، گو یا کہ تمام را بہ مرجان مرصع ساختہ اند، و بعد زمانے ہمیں جاہا سفید می شود، وبہ طریق پنبہ نظر در می آید، بوقلمون آسا ہر زمان برنگے دیگر دیدہ می شود،

دو پارچہ گوشتی کہ بر سر دارد، بہ تاج **خروس** مشابہ است، غریب این است کہ در ہنگام

مستی پارچہ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالائے سر او تا یک وجب می آویزد و باز کہ

آنرا بالامی کشد، چوں شاخ کرگدن بر سر او مقدار دو انگشت نمایاں می گردد، اطراف

چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست[1]"

جہانگیر جب کسی جگہ کے کیف پرور اور خمار آگین مناظر سے متاثر ہوتا تھا، تو اپنی کیفیات و

جذبات کو اسی انداز سے تحریر میں لاتا تھا، کشمیر کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہے، اور پھر لکھتا ہے،

"کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنیں حصار بادشاہاں را گلشنے است

عشرت افزا و درویشاں را خلوتکدۂ دلکشا، چمنہائے خوش و آبشار ہائے دلکش از شرح

و بیان افزون، آبہائے رواں و چشمہ سارہائے از حساب و شمار بیرون، چندانکہ نظر

کار کند سبزہ است و آب رواں، گل سرخ و بنفشہ و نرگس خود رو صحرا صحرا انواع

گلہا و اقسام ریاحین ازاں بیشتر است کہ بشمار در آید، در بہار جان نگار کوہ و دشت

از اقسام شگوفہ مالامال، در و دیوار و صحن و بام خانہا از مشعل لالہ بزم افروز و چلکہائے

مسطح و سہ برگہا مئے مبروج را چہ گوید،

شدہ جلوہ گر ناز نینان باغ،	رخ آراستہ ہر یکے چون چراغ
شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست،	چون تعویذ مشکیں ببازوے دست
غزل خوانی بلبل صبح خیز،	تمنائے مے خوارگان کردہ تیز،
بہر چشمہ منقار بط آب گیر،	چو مقراض زریں بقطع حریر،
بساط گل و سبزہ گلشن شدہ	چراغ گل از باد روشن شدہ

[1] تزک جہانگیری بحوالہ مقالات شبلی تنقیدی جلد چہارم ص ۸۴ - ۸۵،

بنفشہ سر زلف را خم زدہ	گرہ در دل غنچہ محکم زدہ[1]،

جب وہ سوگوار اور مغموم ہوتا ہے، تو اسی دردناک پیرایہ میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے، خسرو

کی ماں خسرو کی باغیانہ اور ناشائستہ حرکتوں سے عاجز آکر افیون کھا لیتی ہے، اسکی موت پر جہانگیر جس طرح

ماتم کرتا ہے، وہ ملاحظہ ہو:-

از خوبی ہا و نیکذاتی ہا کہ او چہ می نویسم عقلے بہ کمال داشت، و اخلاص او بہ من در درجہ بود کہ ہزار

پسر و برادر را قربان یک موے من می کرد مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و او را دلالت

بہ اخلاص و محبت من می کرد، چون دید کہ ہیچ فائدہ ندارد..... از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی

است، خاطر بر مرگ خود قرار داد..... روز بست و ششم ذی الحجہ سنہ ۱۰۱۳ افیون بسیار در عین شوریدگی

دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت..... از فوت او بنا بر تعلقے کہ داشتم، ایامے بر من

گذشت، کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر

باشد از غایت کلفت و اندوہ از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گذشت، چوں این

قصہ بہ والد بزرگوارم رسید دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدین مرید فدوی

صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر بر داشتہ بودند، ہماں طور بستہ بجہت

من فرستادند، این عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار

مرا فی الجملہ قرار و آرامے بخشید[2]"

جہانگیر کی بیقادر الکلامی صرف نثر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ اسکی نکتہ سنج اور سخن شناس طبیعت

میں شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، بقول مولانا شبلی "سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمانروا سخن فہم و

اداشناس گذرا ہے، لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۲، [2] ایضاً ص ۲۶

در منزل لیکر آیا تھا، اس کا اثر اگرچہ اوس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہونے دیا، یہاں تک کہ تزک میں نورجہاں کا جہاں جہاں ذکر آیا، مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اسلئے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھکر کون ہو سکتا تھا،" (شعر العجم حصہ سوم ص۱۶۵)

وہ خود شاعر تھا، چنانچہ مندرجۂ ذیل اس کی ایک غزل ہے، جو سلاست اور رنگینیِ بیان کے لحاظ سے خوب ہے،

من چوں کنم کہ تیرِ غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد

مستانہ می خرامی و مست تو عالمی — اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد

در وصلِ دوست مستم و در ہجر بے قرار — داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد

مدہوش گشتہ ام کہ بگویم رہ وصال — فریاد ازاں زماں کہ مرا ایں خبر رسد

وقتِ نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر،
امید آنکہ شعلۂ نور اثر رسد[1]

مصنف مخزن الغرائب نے جہانگیر کے جو چند اشعار نقل کئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

ما نامہ بہ برگِ گل نوشتیم، — شاید کہ صبا بادو رساند،

رباعی

ہر کس بضمیرِ خود صفا خواہد داد، — آئینۂ خویش را جلا خواہد داد

ہر چیز کہ شکستہ بود دستش گیر — بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد،

رباعی

اے آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ — اندوہ دل و سوسہ ناکت خوردہ

مانند قطرہائے باراں بزمیں، — جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ،

(مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین ورق ۸۵)

وہ اکثر اساتذہ کے مقابلہ میں شعر کہتا، ایک بار امیر الامرا کا یہ شعر اسکے سامنے پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق، — یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے فوراً کہا،

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یکنفس — یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر است

علی احمد مہرکن نے بھی اس پر ایک شعر کہا، جو جہانگیر کو بہت پسند آیا، وہ شعر یہ تھا،

اے محتسب ز گریۂ پیرِ مغاں بترس — یک خم شکستنِ تو بصد خون برابر است[1]

ایک دفعہ عبد الرحیم خان خاناں نے مولینا جامی کی اس غزل پر غزل لکھی، جس کا ایک مصرع یہ ہے،

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید،

جہانگیر کو یہ مصرع پسند آیا، اس نے فی البدیہہ مطلع کہا،

ساغرِ مے بر رُخِ گلزار می باید کشید — ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید[2]

ماوراء النہر کے درویش صفت بزرگ خواجہ ہاشم سے جہانگیر خاص عقیدت رکھتا تھا، ایک بار خواجہ مذکور کے یہاں اوس نے ایکہزار مہر جہانگیری، اور اسی کے ساتھ اپنی کہی ہوئی مندرجۂ ذیل رباعی بھیجی،

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است — از دولت یاد بودت اے درویش است

چندانکہ ز قرۂ ات دلم شاد شود، — شادیم ز آنکہ لطفت از حد بیش است

[1] تزک جہانگیری ص۱۱۲ [2] اقبال نامۂ جہانگیری و تزک جہانگیری ص۲۲۵،

اسی کے ساتھ جہانگیر نے دربار میں فرمایش کی، کہ اسی مضمون کی، اور رباعیان کہہ کر طبع آزمائی کی جائے، حکیم مسیح الزمان نے ایک رُباعی کہی، جو جہانگیر کو بہت پسند آئی، وہ رباعی یہ ہے

دار یم اگرچہ شغلِ شاہی در پیش، ہر لحظہ کنیم یاد درویشان بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش آن را شمریم حاصلِ شاہی خویش،

جہانگیر نے خوش ہو کر حکیم مذکور کو ایک ہزار مہر انعام میں دیا[1]،

سنہ ۹ جلوس شاہی میں جہانگیر موضع سمونگر شکار کے لئے گیا، اسی شکارگاہ میں ایک رات اس نے یہ شعر کہا،

بود بر آسمان تا مہر را نور، مبادا عکسِ او از چتر شہ دور،

اور قصہ خوانون کو تاکید کی کہ سلام وصلوٰۃ بھیجتے وقت یہ شعر بھی پڑھا جائے،[2]

سنہ ۱۲ جلوس میں سید عبد اللہ خان بارہہ شاہزادہ خرم کی یہ عرضداشت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ عادل خاں، عنبر اور دکن کے تمام سرکشوں نے اطاعت اختیار کر لی ہے، جہانگیر یہ مژدہ سنکر نہایت خوش ہوا، اور شادیانے کے نقارے بجوائے، سید عبد اللہ خاں کو سیف خاں کا خطاب دیا، شہزادہ خرم کے لئے ایک لعل بے بہا بھجوایا، اور عادل خاں کے نام فرمان جاری کیا، جسمیں یہ طبعزاد شعر مرقوم کیا،

شدی از التماس شاہ خرم، بفرزندی ما مشہور عالم،[3]

اسکے دوسرے سال عادل خان نے جہانگیر کی ایک تصویر کی درخواست کی، جہانگیر نے ایک لعل گران بہا و لعل خاصہ کے ساتھ اسکو اپنی تصویر عنایت کی، اور اس پر یہ رباعی دست خاص سے لکھ دی،

---

۱ تزک جہانگیری ص ۱۵۱، ۲ ایضاً ص ۱۸۰، ۳ ایضاً ص ۱۹۳،

اے سوے تو دایم نظرِ رحمتِ ما آسودہ نشیں بسایۂ دولتِ ما
سوئے تو شبیہ خویش کر دیم روان تا معنی ما بہ بینی از صورتِ ما[1]

سنہ ۱۴ جلوس میں جہانگیر کلانور میں مقیم تھا کہ خان عالم جو شاہ عباس کے پاس ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا، واپس آیا، جہانگیر اسکے ساتھ بہت ہی لطف و عنایت کے ساتھ پیش آتا تھا، جب اوس کے نزدیک آنے کی خبر ہوئی، تو اوس نے اُسے مندرجۂ ذیل مطلع لکھ کر عطر جہانگیری کے ساتھ بھیجا،

بسویت فرستادہ ام بوے خویش کہ آرم ترا زود تر سوے خویش،[2]

جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ وہ اپنے سکوں پر بھی اسکا مظاہرہ چاہتا تھا، چنانچہ سو تولے، پچاس تولے، بیس تولے اور دس تولے کی مہرون پر یہ بیت لکھی ہوئی تھی،

بخط نور بر زر کلکِ تقدیر، رقم زد شاہ نور الدین جہانگیر،

مصرعون کے درمیان میں جگہ چھوڑ کر کلمہ اور دوسری طرف یہ بیت جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے منقش تھی،

شد چو خور زین سکہ نورانی جہان آفتابِ مملکت تاریخ آن،

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر تھا،

روے زر را ساخت نورانی برنگِ مہر و ماہ شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جب نورجہاں کا اقتدار جما تو سکہ پر یہ شعر ثبت کیا،

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

---

۱ تزک جہانگیری ص ۲۷۶، ۲ ایضاً ص ۳۲۷

جہانگیر کی سخن فہم اور ذوق شناس طبیعت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی، کہ اسکے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بدمذاقی کی جائے، ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاجِ دولت برسرت از ابتدا تا انتہا،

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو، ؟ شاعر نے کہا حضور نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا، ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت برسرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

مولینا شبلی تذکرۂ سرخوش سے شعر العجم حصہ سوم میں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں، کہ اس زمانہ میں تقی تخلص کا ایک شاعر تھا، جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، تقی نے نورجہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن نورجہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، تقی نے یہ شعر پڑھا،

تقی بگریہ سرے دار دائے نصیحت گر ‌‌‌‌‌ کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشہ کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی، تقی نے مطلع پڑھا،

من می روم و برق زنان شعلۂ آہم ‌‌‌‌‌ اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنسکر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے، [1]

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم ان اشعار کا ذکر کریں، جن کو جہانگیر نے خاص طور پر پسند کیا،

[1] تذکرۂ سرخوش ذکر تقی، و شعر العجم حصہ سوم، ص ۹،

اور ان پر اپنی رائے ظاہر کی، تاکہ ناظرین کو اس کا صحیح مذاق معلوم ہو، مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ "جہانگیر کا ذوقِ شاعری اسی قدر صحیح تھا، جس قدر ایک بڑے نقادِ فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے بڑھکر اسکے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا"،

سنہ ۱۳ جلوس میں مانڈو (فتح پور) کے ایک تال کے قریب فروکش ہوا، تو وہاں ایک ستون پر ایک رباعی لکھی ہوئی دیکھی، اسکے بارے میں لکھتا ہے،

"درمیان تال نشیمنے از سنگ واقع است بریکے از ستونہا این رباعی شخصے ثبت نمودہ بود بنظر در آمد و مرا از جا در آورد، الحق از شعرہائے خوب است"، رباعی

یاران موافق ہمہ از دست شدند ‌‌‌‌‌ در دستِ اجل یگاں یگاں پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر ‌‌‌‌‌ یک لحظہ زما بیشترک مست شدند

اسکے بعد فوراً ہی لکھتا ہے،

"دریں وقت رباعی دیگر ہم ازیں عالم شنیدہ شد، چون بسیار خوب گفتہ آن را نیز نوشتم"

رباعی

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند ‌‌‌‌‌ از خاطر ہمدمان فراموش شدند،

آنا کہ بصد زبان سخن می گفتند، ‌‌‌‌‌ آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند، [1]

ایک بار سلطان قوام کے بیٹے حسینی کی ایک رباعی اسکے سامنے پڑھی گئی، اسکو پسند آگئی، جہانگیر نے تزک میں بھی نقل کی ہے، وہ رباعی یہ ہے،

گردے کہ تر از طرفِ داماں ریزد ‌‌‌‌‌ آب از رخِ سرمۂ سلیماں ریزد،

گر خاک درت بامتحاں بفشارند ‌‌‌‌‌ از وے عرقِ جبینِ شاہاں ریزد،

[1] تزک جہانگیری ص ۲۶۰، نولکشور پریس

اس رباعی کو نقل کرکے وہ لکھتا ہے:-

"معتمد خان دریں وقت رباعی خواند، مرا بغایت خوش آمد، و در بیاض خود نوشتم"

رباعی

زہرم بفراقِ خود چشانی کہ چہ شد   خوں ریزی و آستیں فشانی کہ چہ شد

اے غافل ازانکہ تیغ ہجر توچہ کرد   خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد[1]

یہ رباعی بابا طالب اصفہانی کی تھی،

سلطان سنجر کے ملک الشعراء معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھا تھا، اسکے سامنے پڑھا گیا، جسکا مطلع یہ تھا،

اے آسماں مسخرِ حکم روان تو،   کیوان پیر بندۂ بخت جوانِ تو،

اس مطلع کو سن کر وہ بہت محظوظ ہوا، اور اس قصیدہ کی تعریف تزک میں کرتا ہے، کہ

"بغایت سلیس و ہموار گفتہ"،

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدہ کے تتبع میں ایک قصیدہ کہکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے پسند کیا، اسکی تعریف کرتے ہوئے کچھ اشعار تزک میں نقل کئے ہیں،[2]

ایک بار ایک ہندو شاعر نے جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی جس کا حاصل تھا، کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا، تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اس کا بیٹا اسکے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے انکے انتقال کا غم نہ کیا، آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے نور سلطنت میں کہیں رات نہیں، جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سنکر بہت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی انعام میں

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰۹، نولکشور پریس، [2] ایضاً ص ۲۴۲،

دیکر دیا اور لکھتا ہے،

"ایں تازگی مضمون از شعراے ہند کم بگوش رسیدہ، بہ جلدوی ایں مدح فیلے باو مرحمت کردم"

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا، جو حسب ذیل ہے:-

گر پسر داشتی جہاں افروز   شب نہ گشتی ہمیشہ بودی روز

زانکہ چوں او نہفتہ افسرِ زر   بہ نمودی کلاہ گوشہ پسر

شکر کز بعد آن چنان پدرے   جانشیں گشت ایں چنیں پسرے،

کز شنفار گشتنِ آن شاہ   کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ[1]

جہانگیر کو طالب آملی کے مندرجہ ذیل اشعار بہت مرغوب تھے،

زغارتِ چمنت بر بہار منتہا است   کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

لب از گفتن چنان بستم کہ گوئے   دہان بر چہرہ زخمی بود و بہ شد

عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع   ایں شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش ست

گرمن بجائے جوہر آئینہ بودمے   بورو نما تر اتبو کے می نمودمے،

دو لب دارم یکے در می پرستے   یکے در عذر خواہی ہائے مستے

جہانگیر کے اس انتخاب پر مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا،[2]

شعراء و علماء کی سرپرستی، شہزادگی کے زمانہ سے شعراء اسکے دربار میں ملازم رہتے تھے، تخت سلطنت پر بیٹھا تو دربار شعراء سے بھرا ہوا تھا، مگر اس نے مردم شناسی سے کام لے کر کم سن طالب آملی کو اپنے دربار کا ملک الشعراء بنایا، طالب آمل کا رہنے والا تھا جو مازندران کا ایک شہر ہے، سولہ برس کی عمر میں اس نے

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰۱، [2] شعر العجم حصہ سوم ص ۵۷،

ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف، اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، تیموری حکمرانوں کی فیاضیاں سن کر ہندوستان آیا، اور جہانگیر کے دربار میں ۲۰ برس کی عمر میں ملک الشعراء کے عہدہ پر ممتاز ہوا، اور آخر تک جہانگیر کی شاہانہ سرپرستی میں نہایت عزت و احترام سے زندگی بسر کی، صرف ایک موقع ایسا پیش آیا، کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہو گیا، اور طالب چند روز تک شرفِ حضور سے محروم رہا، اس واقعہ کو وہ نہایت لطیف پیرایہ میں ایک قصیدہ میں ادا کرتا ہے[1]؛

نظیری نیشاپوری بھی اس کے دربار سے بسلسلۂ ملازمت منسلک تھا، ۵ھ جلوسِ شاہی میں اس کا شہرہ سنکر جہانگیر نے دربار میں طلب کیا، نظیری نے انوری کے اس قصیدہ پر،

بازایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را

ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا، جہانگیر نے اس کے صلہ میں ہزار روپیہ، گھوڑا، اور خلعت عطا کیا، اور اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا[2]، جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتبہ کی فرمایش کی، اس نے ایک غزل لکھ کر پیش کی جسکا مطلع یہ تھا،

اے خاکِ درت صندلِ سرگشتہ سراں را ‎ ‎ ‎ ‎ بادہ مژہ، جاروبِ رہت تاجوراں را

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بگھہ زمین انعام میں دی[3]،

عرفی بھی جہانگیر کی سرپرستی کا رہینِ منت رہا، جہانگیر نے اپنے ایام شاہزادگی میں قاصد بھیجکر اس کو دربار میں بلایا، اور قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی، تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادہ سلیم کا جاندادہ تھا، وہ اپنی زندگی کی ۳۶ ویں بہاریں گذار رہا تھا، کہ حاسدوں نے اسکو زہر دیدیا، بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کیساتھ عشق کا اظہار تھا،

[1] قصیدہ شعر العجم حصہ سوم ص ۱۰۰ میں دیکھو، [2] تزک جہانگیری ص ۹۲، [3] سرو آزاد بحوالہ شعر العجم حصہ سوم ص ۱۴۰،

ملا حیاتی گیلانی بھی جہانگیر کے دربار سے منسلک تھے، گیلان کے رہنے والے تھے، عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان پہنچے، حکیم ابوالفتح گیلانی کی وساطت سے اکبری دربار میں متعارف ہوئے، اکبر کے بعد جہانگیر کی ملازمت میں آئے، وہ ان کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا آخر عمر تک وہ جہانگیر کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتے رہے، بہت ہی پرگو شاعر تھے، سات ہزار اشعار ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، خسرو و شیریں کی بحر میں قصہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے خوش ہو کر اس صلہ میں انھیں سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا، مصنفِ میخانہ لکھتا ہے،

"مثنوی در بحر خسرو و شیریں مبنی بر قصۂ سلیمان و بلقیس بنام ایں بادشاہ ستارہ سپاہ برشتۂ نظم در آورد، چون بسمع اشرفِ اقدس جہاں پناہ، سید حیاتی را بعلۂ آں زر کشید تا حیاتی در حیات بود از بندگیِ ایں بادشاہ انجم سپاہ محروم نہ گشت، ہمہ جا در سفر و حضر خدمت آں حضرت بسر می برد"[1]

ان کے علاوہ اور جن شعراء نے جہانگیر کے جود و سخا کی زلہ ربائی کی وہ بابا طالب اصفہانی[2]، ملا محمد صوفی، مازندرانی سیدائے گیلانی، میر معصوم کاشی، فسونی کاشی، ملا حیدر خصالی، اور شیدا تھے، جہانگیر کی قدردانیوں کے سبب دربار میں علماء بکثرت تھے، یہاں پر بے جا نہ ہو گا، اگر ان میں سے ہم بعض کا تذکرہ کریں،

مولینا مرزا شکر اللہ شیرازی، شیراز، قزوین، عراق اور عرب سے علوم متداولہ حاصل کر کے ہندوستان آئے، نسخ، تعلیق اور علم سیاق میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، پہلے عبدالرحیم خانخانان

[1] میخانہ مولفہ ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، مرتبہ محمد شفیع ام، اے، ص ۵۳۶، [2] اقبالنامۂ جہانگیری معتمد خان بخشی، ص ۳۰۰، کلکتہ،

کی فیاضیوں کے خوشہ چیں ہوئے، پھر جہانگیر کی ملازمت میں آئے، جہانگیر نے انھیں شہزادہ خرم کی ماتحتی میں عہدۂ دیوانی پر مامور کیا، اپنے عہدہ میں بہت کامیاب رہے، پھر اودے پور کی مہم میں کچھ خدمت جلیلہ انجام دی، اس لئے جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ میں انھیں افضل خاں کے خطاب سے مشرف کیا، اور اجمیر کا ناظم بنا کر بھیجا[1]

مولینا تقیای شوستری شیراز سے تعلیم کی تکمیل کرکے ہندوستان آئے، ان کے بارے میں مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے،

مولینا تقیای شوستری طالب علمے بے مثال و قرین و منشی و شاعری سخن آفرین است

در اقسام منظومات غیوری تخلص می فرماید[2]

جہانگیر نے انھیں صدارت کے منصب سے سرفراز کیا[3]

جہانگیر کے عہد کے دوسرے علماء کے نام جو مصنف اقبال نامہ جہانگیری نے بتائے ہیں، وہ یہ ہیں ملا روزبہان شیرازی، میر ابوالقاسم گیلانی، اعمی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ظہطی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا عبد المطلب سلطانپوری، ملا عبد الرحمن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، ملا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری اور ملا محمد جونپوری[3]

جہانگیر ہر مذہب و قت کے علماء سے بہت بے تکلفی کے ساتھ ملتا تھا، اور ان کے متعلق جو رائے ظاہر کرتا تھا، وہ بڑی محققانہ ہوتی تھی، شیخ عبد الحق دہلوی سے ملا، تو لکھتا ہے،:-

"مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی ست، صحبتش بے ذوق نیست، بہ انواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم"

انکی تصنیف تذکرۂ اولیائے ہند کے بارے میں رائے ظاہر کرتا ہے:-

[1] مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۳، [2] ایضاً ص ۹۶، [3] اقبالنامہ جہانگیری ص ۳۰۰،

"کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بنظر در آمدہ بخیلے زحمت کشیدہ"[1]

میر عضد الدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی، تو اسکے متعلق جہانگیر لکھتا ہے

الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علمار قدما مستشہد آوردہ، درین فن کتابے بہ شمل این نمی باشد[2]

مولینا شبلی جہانگیر کی اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں، کہ "فارسی کا ایک محقق اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھکر کیا رائے دیسکتا ہے، فارسی لغت میں جسقدر کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں، کسی میں قدماء کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا، اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہے"[3]

وہ ہندو سنیاسیوں اور درویشوں سے اسی فراخدلی، اور عقیدتمندی سے ملتا جسطرح علمائے اسلام سے پیش آتا تھا، ۱۰۲۶ھ جلوس میں جب اوجین گیا، تو اسے معلوم ہوا کہ ایک سنیاسی مرتاض جدروپ نامی دنیا سے کنارہ کش ہوکر ایک دشوار گذار بھٹ میں رہتا ہے، جس کا طول ساڑھے پانچ گرہ اور عرض ساڑھے تین گرہ تھا، یہ اسقدر تنگ تھا، کہ اس میں مشکل سے ایک شیر خوار طفل سما سکتا تھا، جہانگیر کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، وہاں تک سواری پہنچ نہ سکتی تھی، اسلئے وہ تین میل پاپیادہ چلکر وہاں پہنچا، اور چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا، اس ملاقات کی نسبت لکھتا ہے:

"الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است، در مجلس او محفوظ و مستفید می توان شد، علم بیدانت راکہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی بہ او صحبت داشتم، سخنان خوب مذکور ساخت، چنانچہ خیلے در من اثر کرد"

اس ملاقات سے وہ سیر نہیں ہوا، پھر گیا، چنانچہ لکھتا ہے:-

"باز خاطر را بملاقات گسائیں جدروپ رغبت افزود بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت

[1] تزک جہانگیری ص ۲۸۴، [2] ایضاً ص ۲۰۹، [3] مقالات شبلی جلد چہارم ص ۱۱۲

داشتہ شد، سخناں بلند درمیان آمد حق جل وعلی غریب توفیقے کرامت فرمودہ فہم عالی فطرت بلند ومدرکہ تند را با دانش خداداد جمع ودل آزادساختہ پشت پا بر عالم ومافیہا زدہ در گوشہ تجرید مستغنی وبے نیاز نشستہ"

اوجین سے رخصت ہوتے وقت اس کے پاس پھر ملاقات کو گیا، الوداعی ملاقات اس پر شاق گذری، لکھتا ہے،

"بازبلاقات گسائیں رفتہ از وداع شدم، بے تکلف جدائی از صحبت او بر خاطر حقیقت گزین گرانی نمود"[1]

جہانگیر اور کتبخانہ ومدارس

جہانگیر ایک شاندار کتب خانہ کا مالک تھا، مکتوب خان اس کا مہتمم تھا، جب وہ سفر میں جاتا تو بھی ایک کتبخانہ ساتھ لے جاتا تھا، چنانچہ تزک میں ہے کہ جب وہ گجرات پہنچا، تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتبخانہ سے تفسیر حسینی، تفسیر کاشفی، اور روضۃ الاحباب نذر کیا،

اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام رکھا تھا، کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مرجاتا، تو اس کے مال ومتاع سے مدارس اور خانقاہیں بنوا تا تھا،[2] تاریخ جان جہاں میں ہے کہ اس نے ان تمام مدارس کو از سر نو ترتیب دیا، جو گذشتہ تیس سال سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے،[3]

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰۳، [2] منتخب اللباب خافی خان، [3] تاریخ جان جہان بحوالہ پروموشن آف مجڈن لرننگ ص ۰۵،

مقالات شبلی (تنقیدی) جلد چہارم

یعنی مولینا شبلی مرحوم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس میں ہمایوں نامہ، مآثر جیسی، تزک جہانگیری وغیرہ جیسی اہم کتابوں پر مفصل ریویو ہے،

ضخامت: ۱۹۰ صفحے، قیمت: ۱۲ر

منیجر

دیوان شمس تبریز اور مولینا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن،

(۷)

دیوان میں حضرت شمس کی قونیہ کی واپسی پر جگہ جگہ مسرت وخوشی کا اظہار پر جوش طریقہ پر کیا گیا ہے

مسکین دل وآوارہ آن گم شدہ یکبار — چوں بشنود این چارہ خوش رقص کنان آمد

بہار آمد بہار آمد بہار خوش عذار آمد — خوش وسرسبز شد عالم اوان لالہ زار آمد

صنوبر گفت راہ سخت سان شد بفضل حق — کہ ہر برگے کہ سر بر زد چو تیغ آبدار آمد

ز شمس الدین تبریزی رسد بادم بنور روی — کہ ہر قطرہ ازان جرعہ چو در شاہوار آمد

بہار آمد بہار آمد بہار مشکبار آمد — نگار آمد نگار آمد نگار بردبار آمد

سماع آمد سماع آمد سماع بے صداع آمد — وصال آمد وصال آمد وصال پایدار آمد

صلایا ایہا العشاق کان مہر نگار آمد — میان بندید عشرت را کہ یار اندر کنار آمد

مہ دی رفت وبہمن رفت ساقی نوبہار آمد — زمین سرسبز وخرم شد اوان لالہ زار آمد

الا اے شمس تبریزی توئی سبزی ہر بستان — شقائقہا وریحان ہا ز خوبت خوش عذار آمد

حضرت شمس کی واپسی کے بعد ایک عرصہ تک علم وعمل اور ذوق وحال کی مجلس نہایت گرم رہی،

"مدتے بسیار برین سیاق از وفاق بے نفاق روز وشب در ذوق جمعیت می بودند"

"شب وروز بصحبت یک دگر مستغرق می بودند"

(سپہ سالار ص ۶۹)

اتفاقاً پھر بعض اصحاب کو حضرت شمس کی طرف سے خلش ہوئی، ان میں علاء الدین چلپی مولینا کے فرزند متوسط بھی تھے، یہ لوگ حضرت شمس کے استخفاف پر آمادہ ہوئے، اور موجب انفعال حرکات ان سے سرزد ہوئے، حضرت شمس کمالِ حلم سے خاموش رہے، لیکن ایک دن سلطان ولد کو اشارۃً اس حال کی طرف توجہ دلائی، اور اسی دوران میں غائب ہوگئے،

"دران مدت ناگاہ غیبت فرمود حضرت خداوندگار رجلی الصباح چون در مدرسہ آمد، و خانہ را از ایشان خالی یافت، چون ابر بخروشید و روز و شب در فراق آنحضرت غزلیات بیان می آورد و ند" (سپہ سالار)

دمشق کی طرف حضرت شمس کی دوبارہ واپسی، دیوان میں اوس کی شہادت، دیوان میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

شمس تبریزی مگر چون باز آمد از سفر   یک چند بودا ندر رشتہ ہجو عنقا بے نشان

آخر کار درد ہجر کی شدت سے بیتاب ہو کر حضرت شمس کی تلاش میں مولینا دمشق تشریف لے گئے، کئی اصحاب بھی ہمرکاب سعادت تھے،

"حضرت خداوندگار عظم اللہ ذکرہ جہت حکمت و مصلحت بطلب ایشان باتمامت عزیزان و مقربان بجروسۂ دمشق رفتند" (سپہ سالار ص ۶۹)

مولینا کا سفر دمشق، دیوان میں اس واقعہ کا اظہار دیوان میں اس سفر کے متعلق یہ شعر ہے:-

از عشق چو شبدیہ دم در عشق سفر کردم   یارب چہ سعادتہا کز این سفرم آمد

تاریخ اور دیوان کے اس ربط سے ہمارے اس دعوی کی مزید تصدیق اور تائید ہوتی ہے کہ دیوان شمس تبریز مولینائے روم کے ابیات کا مجموعہ اور انہی کے جذبات کی ترجمانی ہے،

غزل را از زبان شاہ گفتم   کہ شاہم جز کہ گو یارا نخواہد،

چند مزید قطعی شہادتیں ابتک داخلی ثبوت میں جو براہین ہم نے پیش کئے ہیں، ان کے اثبات کیلئے تاریخ و تذکرہ سے مقابلہ کرنا پڑا، لیکن ذیل میں ہم ایسے دلائل پیش کرتے ہیں، جو اپنے آپ اس امر کے قطعی شواہد ہیں، کہ دیوان شمس تبریز مولانائے روم کے افکار کا مجموعہ ہے،

ہم نے گذشتہ بحث میں یہ بیان کیا ہے، کہ مولینا اپنے اشعار میں اپنا نام یا تخلص باندھنے کی رسم عام کے پابند نہیں ہیں، اکثر غزلیات میں تو حضرت شمس کا نام آیا ہے، لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ اسکی نوعیت صاحبِ کلام شاعر کے تخلص کی بالکل نہیں، بلکہ وہ ہر جگہ اسم ممدوح کی حیثیت رکھتا ہے، اسکے برعکس جیسے مثنوی میں بھی مولینا کی عادت ہے، دیوان میں بھی کہیں کہیں کسی موقع پر اپنا تخلص و نسب (رومی یا ملائے رومی یا لقب مخفف (جلال) یا خطاب (مولینا) لکھدیا ہے، جو اس امر کی قطعی شہادت ہے، کہ دیوان مولینا کا کلام ہے، کیونکہ اگرچہ ان کا نام چند مواقع پر آیا ہے، لیکن انکی حیثیت ممدوح کی سی نہیں جیسے باوجود کثرتِ ذکر کے حضرت شمس کے اسم کی حیثیت ہے، بلکہ یہ نام اس طرح استعمال ہوا ہے جیسے کسی شاعر کا نام یا تخلص اسکے کلام میں آتا ہے،

مولینا دیوان میں اپنی طرف بلفظ مولینا اشارہ کرتے ہوئے اپنی محفلِ سماع کا ذکر اسطرح فرماتے ہیں

سماعی می رود در مجلسِ ما   کہ ذوقش می کند صفت آسمان طے،

شراب و شاہد و شمع است و مجلس،   نوائے ارغنون و نالۂ نے،

در مے خانہ باقی کشادیم،   صلا در دہ آیا ساقی مگو کے،

دریں دریائے توحیدش شدم گم   نہ بے وے می توان بودن نہ با وی

چو مولینا برقص آید ز مستی،   برقص آید موجودات با وے

معاً اپنے آپ کو شاعرانہ طور پر غیر فرض کر کے اور اس کا اعتراف فرماتے ہیں، کہ یہ سب کچھ ان کو حضرت ہی کے طفیل سے حاصل ہے،

نہ مولیناست ایں بحر درافشان   حقیقت شمس تبریزی ست باوے

حضرت شمس کا نام بار بار دیوان میں کیوں آتا ہے، اس حقیقت کو بے نقاب فرماتے ہیں،

نام شمس الدین تبریزی ہمی گوہر دہے   تا بگیرد شعر و نظمت رونق و رعنائیے

اس مضمون کے دو شعر اور ہیں:۔

برخوان تو حدیث شمس تبریز،   خوش باش ازین و آن بپرہیز

مفخر تبریز جان شمس حق اے یار ما   رونق گفتار مائی اے زینت اشعار ما

دیوان کو دیکھئے تو یہ ان دونوں صفات کا حامل ہے، جو ان دو اشعار میں بیان کئے گئے ہیں، دیوان میں جذبات محبت کی جو شدت ہے، حضرت شمس ہی کی وجہ سے ہے، جوش عقیدت کے جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ دیوان کی رونق و رعنائی میں اضافہ کرتے ہیں،

ایک خاص ثبوت، | ایک نصیحت آمیز غزل کے چند اشعار یہ ہیں:۔

ای ز اقلیم عدم آمدہ در ملک وجود   ہیچ دانی کہ ترا آمدن از بہر چہ بود

بندۂ بادشہی شاہ فرستاد ترا   تا تو خود را بشناسی و بدانی معبود

اس ناصحانہ کلام کے مقطع میں ارشاد ہوتا ہے،

این نصیحت کہ شنیدی سخن مولینا است   گفت شمس الحق تبریز بدمیان فرمود

اجمال | ایک غزل اپنے متعلق لکھی ہے جس کا مطلع ہے،

وقت سحرگہ از دم طائی رومی میرسد،   قم گفت اے دیوانگان طائی رومی میرسد

گفتم کہ تو دیوانہ گفتا تو ہم دیوانہ شو   از خویشتن دیوانہ شو ملای رومی میرسد

مقطع میں بھی حضرت شمس سے خطاب ہے،

ای باد صبح آخر بگو با شمس تبریزی خوش   بلبل عالم بر خوش بر ملای رومی میرسد

اپنے آپ کو مطرب شمس کی حیثیت سے ان کی مدح میں ایک غزل لکھنے کا حکم دیتے ہیں،

ای مطرب شمس دین بگو این غزل از برائے او   تا دل و جان و دیدہ را ابر سنائی و دمت کند

شمس تبریز اور مولینا کا ربط، | دیوان میں مولینا نے اپنے اور شمس تبریز کے ربط کا بکثرت مختلف پیرایہ میں اظہار فرمایا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں،

شمس تبریز است مولانائے روم،   جملہ عالم عاشقاں را سود باد،

رومی روز عید ہزیمت چہ دست یافت   از تخت ملک زنگی شب را فرو کشید

شما ایمان نگاہ دارید گم ای مسلمانان   کہ مولانائے رومی شود مسلمان او کافر شد

مولینا نے سلطان ولد کو بھی حضرت شمس کی عقیدت و ارادت کے سپرد کر دیا، جو ان کے محبوب ترین فرزند تھے، فرماتے ہیں،

چو مولینا ولد را داد بخشش،   ازین پس ہیچ دنیا را نخواہد،

مولینا اکثر غلبۂ حال کے وقت اشعار اور غزلیات لکھتے تھے، ان میں انکے جوش عشق کا تو اظہار پوری طرح ہوتا ہے، لیکن حسن بیان، اور شعر کے ظاہری محاسن کی انھیں کچھ پروا نہیں، اسپر خود ہی اظہار خیال فرماتے ہیں،

شمس تبریز بجز عشق ز من ہیچ مجوئے   زان کسے داد سخن جو کہ سخنداں باشد

ایک شعر میں مولینا رومی اپنا آپ اقرار فرماتے ہیں، کہ مولینا رومی کون ہیں، جس سے اس لفظ کے متعلق شک و شبہہ دور ہو جاتا ہے،

مولانۂ رومی منم سبلت کن شیطان منم   تازہ کن ایمان منم دم ز اللہ ہو زنم

ہم پیرم و برناستم پیرا ستم برناستم   پنہا منم پیدا منم من میر مولاناستم

بوئے خمش را در کوزہ نقاع کرد؟   شد ہزاران ترک رومی بندۂ ہندو تخم

ایک غزل میں حضرت شمس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار بڑے جوش سے فرماتے ہیں،

گر بزنی مجرم جز راہِ عشق نسپرم — رومی خستہ خاطرم دست منست و دامنت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولینا کس کے دامن کے متعلق فرما رہے ہیں یعنی "دامنت" میں کس سے خطاب ہے، جواب دوسرے شعر میں ہے،

شمس جلال من توئی صبح وصال من توئی — واقفِ حال من توئی دست منست و دامنت

مولینا کا تخلص، مولینا کا کوئی تخلص خاص طور پر معین نہ تھا، کہیں مولینا کہیں رومی استعمال کرتے ہیں، کہیں اپنے لقب جلال الدین کا پہلا جزو لفظ جلال استعمال کرتے ہیں، سپہ سالار میں ایک شعر نقل کیا گیا ہے،[1]

چگونہ بر نپرد جان چو از جناب جلال، — خطاب لطف چو شکر بجان رسد کہ تعال

دیوان میں بھی اس کا استعمال بعض مواقع پر کیا ہے،

گر تو شوی تابع مولینا جلال — اظہر شمس است یقیں رہبرم

جگفت مرو آنجا کہ ناگہاں چو جلال — میانِ فتنہ بے حد و منتہات نہند

اس غزل کی قطعیت پر ایک دلیل مزید یہ ہے، کہ مناقب العارفین میں شعر کیا تھا ساتھ اس امر کی تصریح ہو کہ مولینا نے اسے کس محل پر فرمایا،[2]

ایک خاص دلیل، واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ حضرت شمس کی خاطر مولینا سخت امتحان اور آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے، بیٹے علاء الدین اور دیگر عزیزوں سے تعلق منقطع کر لیا، انکی طرف دیوان میں اشارہ فرماتے ہیں،

خاموش کہ بہر شمس تبریز، — در کوزۂ نار امتحانم،

[1] سپہ سالار صفحہ [2] سپہ سالار ص ۶۰، ۶۱ مناقب العارفین میں بھی یہ حال تفصیل سے درج ہے،

مولینا کا ایک خاص اقرار، اس بحث سے جو ہمارا مدعا ہے، مولانا نے اسے خود فرمایا ہے،

غزل را از زبانِ شاہ گفتم، — کہ شاہم جز کہ جو یارا نخواہد،

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "شاہ" سے مراد کون ہے، دیوان ہی میں مولانا اس کا جواب دیتے ہیں کیونکہ مولانا اس لفظ سے بکثرت حضرت شمس تبریز کو مخاطب فرماتے ہیں،

از شاہ عالم شمس دیں پیغام آمد نازنیں — کز جان برو آنگہ نشیں در مقعد صدق صمد

جان جہان و فخر دیں تبریز شاہ شمس دیں — زان قربت عین الیقیں بر جان و دل تکلم زند

یہ قطعی شواہد تھے، جن سے یقین کامل ہوتا ہے، کہ دیوان شمس تبریز مولانا ہی کا نتیجۂ فکر ہے،

ان کے علاوہ کئی اور مختلف نوعیت کے شواہد ہیں، جو اثباتِ مدعا میں معاون ہیں،

مولینا کے معاصرین و مریدین اور ان کا تذکرہ دیوان میں حضرت صلاح الدین زرکوب کی تعریف، حضرت مولانا صلاح الدین مولینا کے برادران راہ اور خاص رفقاے بزم میں ہیں، یہ بھی حضرت کے فیض یافتہ تھے، حضرت شمس اور مولینا کی خلوت میں، انہی کو رفاقت کا شرف حاصل ہوا تھا، حضرت شمس کی جدائی کے بعد مولینا نے انہی کی صحبت میں سکون پایا،

"بعد از غیبت مولینا شمس الدین تسکین و آرام بحضرت شان یافتند"

دیوان میں اس صورتِ حال پر ایک غزل ہے،

آفتابے تافت بر دل از جناب کبریا — شعلۂ آن نور بنگر طلعتِ شمس الضحیٰ

اے خداوند شمس دیں یکدم بلطف و مرحمت — با من سرگشتہ و مجنون و شیدائی درآ

لیکن پھر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں،

آن ضیا نوریست روشن از حسام الدین ما — با صلاح الدین کہ ذاتش نور بخش اولیا

ان سے تعلق نہ صرف روحانی تھا، بلکہ وہ مولانا کے رشتہ دار بھی تھے، اسلئے کہ مولینا نے سلطان ولد کا نکاح انکی صاحبزادی کیساتھ کردیا تھا، سپہ سالار کا بیان ہے،

"حضرت خداوندگار را با شیخ تعلقی و موافقتی تمام بود"

مولینا کی نظر میں ان کی عزت و عظمت بھی بہت تھی،

"پیش از خلافت چلپی حسام الدین رجوع ہمہ مریدان بحضرت او بود"

سلطان[1] ولد نے بھی ان تعلقات اخلاص و محبت کا ذکر اپنی مثنوی میں کیا ہے، ایک دن مولینا شمس کے فراق میں بازار کی طرف نکلے، راستہ میں شیخ صلاح الدین کی دوکان پر سے گذر ہوا، زرکوبی میں مشہور تھے، مولینا پر اس آواز سے حالتِ وجد طاری ہوئی، انھوں نے یہ حال دیکھکر اپنا شغل جاری رکھا، اور نقصان زر کی فکر نہ کی، مولانا ہم آغوش ہوکر جوش اور مستی میں یہ شعر پڑھنے لگے،

یکے گنجے پدید آمد ازیں دوکان زرکوبی | زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

کلیات[2] میں بھی یہ شعر موجود ہے،

یکے گنجے پدید آمد ازیں دوکان زرکوبی | زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

(کلیات شمس تبریز ردیف ی)

ان کی موت کا مولینا کو بیحد رنج ہوا، چنانچہ سپہ سالار لکھتے ہیں کہ

"حضرت خداوندگار عظم اللہ ذکرہ در فوت ظاہر ایشان رقت بسیار فرمود، بعزت و تعظیم ہرچہ باتمامت اعاظم و اکابر قونیہ تشیع جنازہ کردند، و ایں غزل را در ثواب جمال ایشان انشاء فرمودند"

[1] مثنوی سلطان ولد نسخہ قلمی در بیان مناقب صلاح الدین زرکوب [2] سپہ سالار ذکر صلاح الدین زرکوب فیہ مافیہ مطبع معارف، [3] کلیات شمس تبریز ص ۶۹۹، ردیف ی،

اے زہجرانت فراقت آسمان بگریستہ | دل میان خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

یہ غزل کا مطلع دیوان شمس تبریز میں موجود ہے، ہم چند اشعار مثالاً درج کرتے ہیں،

اے زہجرانت زمین و آسمان بگریستہ | دل میان خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

شہ صلاح الدین برفتی اے ہمائے گرم رو | ہم کسے باید کہ داند بر کساں بگریستہ

بر صلاح الدین چہ داند ہر کسے بگریستن | از کمان جستے چو تیرے واں کمان بگریستہ

رسالہ سپہ سالار میں ایک اور غزل حضرت زرکوب کی تعریف میں ہے،

مطربا اسرار ما را باز گو، | قصہ ہائے جانفزا را باز گو،

ما دہان بر بستہ امروز از و، | تو حدیثِ دل کشا را باز گو،

مخزنِ انا فتحنا بر کشا، | سر جانِ مصطفیٰ را باز گو،

چون صلاح الدین صلاح جان ماست | آن صلاح جانہا را باز گو،

دیوان میں بھی یہ غزل موجود ہے،

صلاح الدین کی تعریف میں یہ اشعار قطعی طور پر مولینا کے ہیں، اور دیوان شمس تبریز میں پائے جاتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان شمس تبریز مولینا ہی کا کلام ہے، تذکرہ نویسوں نے حضرت زرکوب کی جو تعریف و توصیف کی ہے، اس غزل میں اس کا ذکر کیا ہے، اگر حضرت شمس کے اشعار ان کی تعریف میں ہوتے، تو اس کا بھی ضرور ذکر کیا جاتا، کیونکہ سپہ سالار میں حضرت شمس اور زرکوب کے ربط و تعلق کا ذکر موجود ہے، اصل میں یہ سب اشعار اس تعلق کا آئینہ ہیں، جو حضرت زرکوب اور مولانائے معنوی میں تھے،

ان اشعار کے علاوہ کلیات میں حضرت زرکوب کے مناقب میں کئی اور اشعار ہیں، جو اس خیال کی تائید و توثیق کرتے ہیں،

شمع دو جہان صلاح دین است — کاندر دو جہاں غریب و تنہاست

چون صلاح الدین بوجد اندر بیامد نزد ما — شکر گفتم کان رفیق با صفا مست آمد است

فرماتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت سے فساد باطن رفع ہو جائے گا،

چون رسیدی بخدمت صلاح الدین، — گر فسادی شوی صلاح آئی

از شاہ صلاح الدین چون دید شود جنبین — دل رو بصلاح آرد و جان مشغلہ بریابد

دوش در خواب بدیدم صلاح الدین را — گسترد سایۂ دولت چو ہمائے برسد

جان حق است شاہ صلاح الدین — کو ز اسرار کردگار بود،

لطفہائے کہ بما شہ صلاح الدین کند — خضر جاں گر باز بیند دم بدم تحسین کند،

حضرت حسام الدین چلپی کی تعریف،

حضرت صلاح الدین زرکوب کے بعد مولینا کے رفیق خصوصی حضرت حسام الدین چلپی ہوئے، نہایت صدق شعار اور ادب شناس واقع ہوئے تھے، طبع کریم اور سیرت حلیم پائی تھی، گفتگو میں جامعیت تھی، اور علم حال سے اصحاب قال کی مشکلات حل فرماتے تھے، مولینا سے مودت و اخوت، عقیدت، اور ارادت کے خاص تعلقات تھے، سپہ سالار کا بیان ہے،

"بعد از شیخ صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ در حال جناب حضرت خداوندگار دہ سال تمام و بعد از ان نیز شیخ و قائم مقام و خلیفہ و امام تمامت اصحاب حضرتش بود، و تمامت اصحاب ملازم ایشاں بودند و بملازمت او تقرب بحضرت خداوندگاری جستند[1]"

حضرت مولینا کے صفات کے مظہر تھے، مثنوی معنوی انہی کی تحریک پر لکھی گئی تھی، مولینا نے مثنوی میں سوائے دفتر اول کے ہر دفتر کے آغاز میں خصوصیت اور تصریح کیساتھ ان سے خطاب کیا ہے، اور متعدد مقامات پر نہایت جوش اور ذوق کے ساتھ ان کی تعریف و توصیف کی ہے، ان سے نہایت محبت و خلوص کا اظہار کیا ہے، جیسے کوئی مرید عقیدت مند اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے

یہی حال زندگی کے تعلقات میں بھی تھا،

"حضرت خداوندگار سلوک بدیشاں بوجہی فرمود کہ کسے گمان بردی کہ مرید ایشان است، و بحقیقت مظہر تمام حضرت خداوندگار ما بود، و تمامت مثنویات بالتماس ایشان مؤلف گشتہ است،........ در بیان مثنویات حقایقے کہ مکتوب است اشارت بسلوک چلپی دارد[1] ...... دیباچہ تمامت مثنویات مزین است، بالقاب شریف او[2]"

مثنوی[2] سے نمونہ کے طور پر چند مدحیہ اشعار ہم درج کرتے ہیں،

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران — گفتہ آید در حدیث دیگران،

اس شعر میں اشارہ شمس تبریز کی طرف ہے، لیکن شعر حسام الدین کے اس اصرار کا جواب ہے، کہ کلام میں شمس تبریز کے حالات وضاحت سے بیان کئے جائیں،

دفتر دوم کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد — مہلتے بایست تا خون شیر شد

چون ضیاء الحق حسام الدین عناں — باز گردانید ز اوج آسماں

چون بمعراج حقایق رفتہ بود، — بے بہارش غنچہا نشگفتہ بود،

دفتر سوم میں ہے،

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار — ایں سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

چوتھے دفتر میں یوں خطاب فرماتے ہیں،

ہمچناں مقصود من زیں مثنوی — اے ضیاء الحق حسام الدین توئی

دفتر پنجم میں فرماتے ہیں،

---

[1] سپہ سالار ص ۴۳، [2] مثنوی مولانا روم کامل مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۲۹۱ھ،

شہ حسام الدین کہ نور انجم است　　طالب آغاز سفر پنجم است،

گر نبودی خلق محجوب و کثیف،　　ور نبودی حلقہا تنگ و ضعیف،

در مدیحت داد معنی دادمی،　　غیر این منطق لبی بکشادمی

دفتر ششم میں انہی کی توصیف بیان کی ہے،

حیات دل حسام الدین بسے　　میل من جوشد بقسم سادسے،

اسی طرح دیوان میں بھی ان کی تعریف و توصیف کے نغمے موجود ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ دیوان شمس تبریز صاحب مثنوی ہی کا کلام ہے، واقعات زندگی مثنوی اور دیوان اس بارے میں ہم آہنگ ہیں، تاریخ اور تذکرہ شاہد ہے کہ مولینا کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ حضرت حسام الدین کے تعلقات اس نوعیت کے رہے ہوں،

آن ضیا نوریست روشن از حسام الدین ما　　با صلاح الدین کہ زآتش نور بخش اولیا

اے شہ حسام الدین ما اے معدن نور ضیا　　اے با تو جانہا آشنا مستان سلامت میکنند

اے حسام الدین جان کن مدح آن سلطان عشق　　گرچہ منکر در ہوائے عشق او دم میزند

اے شہ حسام الدین حسن مگوئی با جانان من کہ　　جان را غلاف معرفت بہر حسامت میکنم

حسام الدین صلاح الدین صالح　　خمش کردم خموشی غم گسار است

عطار و سنائی کی تعریف، | فارسی کے صوفی شعرا میں حکیم سنائی، اور حضرت عطار رح کو اولیت کا شرف حاصل ہے سنائی اور عطار کے کلام اور صوفی پیام دونوں کے اثرات مولانا پر ہوئے، تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں، کہ جب حضرت بہاء الدین بلخ سے قونیہ تشریف لے جارہے تھے، تو نیشاپور میں حضرت عطار ان سے شرف نیاز حاصل کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوئے، مولانا رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ تحفۃً عنایت کی، اور مولینا کی آتش افروزی عشق کے متعلق پیشینگوئی فرمائی،

"در اثنائے آن سفر بہ نیشاپور رسید، شیخ فریدالدین عطار بدیدن مولانا بہاء الدین آمد آن وقت مولینا جلال الدین کودک بود، شیخ عطار کتاب اسرار نامہ را ہدیہ بہ مولنا جلال الدین داد و مولینا بہاء الدین گفت روزے باشد کہ این پسر آتش در سوختان عالم برزند"

مولینا نے مثنوی میں حضرت عطار کا ذکر تعظیم و احترام کیساتھ کیا ہے، اور ان کے اشعار کو بعض بعض مقامات پر اپنے اشعار میں ضم کیا ہے، یہی رنگ دیوان میں بھی ہے، عطار و سنائی کی تعریف و توصیف فرمائی ہے، انکے مرتبہ و عظمت جلال اور مرتبت کی داد کھلے دل سے دی ہے،

گرد عطار گشت مولینا　　شربت از دست شمس بود نوش

ہفت شہر عشق را عطار گشت　　ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم،

عطار روح بود و سنائی دو چشم او　　ما از پے سنائی و عطار آمدیم،

معشوق و عاشق ہر سہ یکے بود　　یکبار چون سنائی سردار آمدیم،

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں،

آن تنا جو کش سنائی شرح کرد　　یافت فردیت و عطار آن فرید

دست در دامن خورشید حقیقت زدہ ایم　　چنگ دل نیز در ان طبلۂ عطار زدیم،

در آن طبلۂ شکر پر کرد عطار　　بگرد طبلۂ عطار گردیم[۱]،

یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ دیوان جس میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں، عطار اور سنائی کے کلام سے متاثر ہونے والے شاعر مولینائے روم کا کلام ہے، نہ کہ حضرت شمس کا،

سپہ سالار کی تعریف، | سپہ سالار اور تذکرۂ سپہ سالار کے متعلق ہم پچھلے باب میں تصریح کر چکے ہیں، سپہ سالار مولانا کے خاص مریدوں سے تھے، تقریباً چالیس سال تک خلوت و جلوت میں مولینا کے ساتھ رہے

[۱] کلیات شمس تبریز ص ۱۹۵، ۲ دیوان شمس تبریز ص ۲۲۳، ۳ ص ۴۴۴

مولانا سے ارادت و عقیدت انھیں بے حد ہے، تذکرہ سپہ سالار جو مولینا کے حالات میں معتبر ترین تذکرہ ہے، اسکی کافی دلیل ہے،

وہ خود اپنے حال میں لکھتے ہین،:-

"خلاصہ عمر خود را بہ ملازمت حضرتِ او مستغرق داشتم،.... لاجرم از محبت عشقِ او هزار بار سوختم، و از خودیِ خود محو گشتم"، (سپہ سالار ص۴)

دیوان میں مولانا نے ان کی بھی تعریف فرمائی ہے،

چو خورشید ست یار من نمی گردد بجز تنہا   سپہ سالار مہ باشد کزا ستارہ حشم دارد

یہ بھی ہمارے دعوے کا اک داخلی ثبوت ہے،

سلطان ولد سے خطاب، سلطان ولد مولینا کے محبوب ترین فرزند ہیں، حضرت شمس تبریزی کی آپ پر خاص عنایت تھی، انھیں سے مرید ہوے، ربط ارادت نہایت قوی تھا،

مولینا دیوان میں کبھی کبھی حضرت سلطان ولد سے بھی خطاب فرماتے ہیں، حجاب خودی کے متعلق سلطان ولد کو نصیحت فرماتے ہین،:-

اے ولد بند ار بند است و حجاب اندر رہش   چو ازین بند در گذشتی جز وصالِ یار نیست

ولدی گوئی در عشقش غزلہا،   چنانکہ گفت عطار و سنائی،

ایک اور ہدایت فرماتے ہیں،

مشو مولا سے ہرناشستہ روئے   کہ تا ایں عشق مولانا نمانے،

حضرت شہاب الدین سہروردی کا ذکر، مولانا نسباً صدیقی ہیں، سلسلۂ نسب میں حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، آپ کے علم اور حقیقت شناسی اور شہرت کا دور دور شہرہ تھا، معاصر صوفیہ دور دور سے دریافت مسائل میں ان سے رجوع کرتے، مولینا کے معاصر بھی تھے، مولانا ان کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک بقید حیات رہے، مولینا نے دیوان میں ان کی ناموری کا بطور مثال تذکرہ فرمایا ہے،

شہابِ آتش یا زندہ باد   چو القاب شہابِ سہروردی

(کلیات شمس تبریز ص۸۴۰)

اوحد الدین کرمانی کا ذکر، تذکرہ نویس لکھتے ہین، کہ جس زمانہ میں مولینا کا قیام دمشق میں تھا، مولینا شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ صدر الدین قونوی کے ہم صحبت رہے ہیں، ان بزرگان امت میں ہر ایک اپنی آپ نظیر تھا، مولینا سے اور ان اولیاے کبار سے حقایق اور اسرار دین پر گفتگو ہوتی رہتی تھی، سپہ سالار نے بھی اسکی تصریح کی ہے،

"وقتے کہ خداوندگار ما در محروسۂ دمشق بود، چند مدت با ملک العارفین موحد مدقق کامل مکمل صاحب الحال والقال شیخ محی الدین ابن عربی و سید المشایخ والمحققین الشیخ السعد الدین حموی و از سید المشایخ شیخ عثمان الرومی و موحد مدقق عارف کامل فقیر ربانی شیخ اوحد الدین الکرمانی و ملک المشایخ والمحدثین شیخ صدر الدین قونوی صحبت فرمودہ اند، و حقایقے کہ تقریر آن طولی دارد، بہمدیگر بیان کردہ، رضوان اللہ علیہم اجمعین،

(سپہ سالار ص۱۴)

مولانا نے دیوان میں بھی اوحد الدین کرمانی کے فیضِ روحانی کا تذکرہ فرمایا ہے، جو غالباً اسی صحبت کا اثر ہے،

ایک مکالمہ کے طور پر فرماتے ہیں،

پیر چو نبض من سوختہ را تجربہ کرد،   گفت ہیہات کہ آن زہر ہمہ سود ابود

مطلب و مقصد عشاق دریں دشت فنا　　نہ علوم و نہ معقول و نہ زیا نست نہ سود

این بگفت و نفس از رفت بمن در نگریست　　نظرِ او ہمہ ہستی ز دلِ من بر بود

گفت اکنون بر و و بادہ خور و شاد بزی　　دور باش از رہ سالوسی و از دلق کبود

کہ دریں رہ ہمگان، از دلِ خود بخبر اند　　مومن و مشرک و ترسا و مجوسی و جہود

گفتم اے شیخ ز حالت خبری دہ تحقیق　　کہ دریں دم نفست بر منِ مسکین بخشود

ایں چنیں حالِ مرا پیش نیامد ہرگز　　چو بیامد تو بخشائے و بکن فیض وجود

پیر حالِ من آشفتہ چو در حیرت دید　　بجواب آئینہ جانِ مرا پاک زدود،

زمن گفتا کہ مرا اوحد کرمانی دان　　کہ بار شاد من آید در غیبت بشہود

ایک غزل میں جو فنائے عالم پر کہی گئی فرماتے ہیں:۔

گر اوحد دہر دہر خویش باقی　　ناگاہ رواں شوی چرا حاد،

(باقی)

بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات

از

پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے، سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڈھ،

مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں نہ صرف بے شمار کتب خانے مشرق و مغرب میں جمع کر کے عام و خاص کے لئے علوم و فنون کے خزانوں کا منہ کھول دیا، بلکہ سب سے پہلے فہرست نگاری کو فن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا، اگر ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا موجد مشہور ہے، تو ابن الندیم کو فن فہرست نگاری کا معلم اول کہنا چاہئے، اسکی کتاب الفہرست جسمیں ۳۷۷ھ تک علوم و فنون کی وہ تمام کتابیں جو زبانِ عربی میں ممالک عرب و عجم میں تصنیف ہوئیں، مع طبقاتِ مصنفین ان کے مناقب و مثالب اور مختصر تبصرہ ان تمام علوم و فنون پر جو اس وقت تک ایجاد ہوئے، ایک شاندار علمی کارنامہ ہے جس کے متعلق مشہور مستشرق براؤن کہتا ہے:۔

"زبانِ عربی کی کسی کتاب کے مطالعہ سے میرے دل میں اسکے مصنف کے تبحر علمی کی عظمت اس قدر قائم نہیں ہوئی، جتنی اس کتاب سے اور اسی اندازہ سے حسرت بھی کہ علوم کے کثیر التعداد اور بیش بہا ماخذ جو مصنف کے زمانہ تک دستیاب تھے، آج ان کا بہت کچھ حصہ برباد اور فنا ہو چکا ہے،"

(لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ۳۸۳)

یہ بربادی زیادہ تر ہولناک سیل تاتار کا نتیجہ ہے، جو ان انمول جواہرات کو پانی کی

طرح بہائے گئی،

ابن الندیم نے جو نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اسکی پیروی زمانہ مابعد میں کتبخانون کی جدا[illegible]
فہرست مرتب کرتے وقت ہوتی رہی، اور اسی کیساتھ مخطوطات کے سرورق پر توضیحات بھی درج ہو[illegible]

ہندوستان کے اسلامی عہد میں نہ صرف بادشاہوں اور امراء کے بیشمار کتب خانے ان کے
ذوق علمی کی یادگار تھے، بلکہ ہر قصبہ اور قریہ میں متوسط الحال بھی اپنی بساط کے موافق کتابوں کا ذخیرہ
جمع کرتے تھے، لیکن زمانہ کے انقلاب سے ان کتب خانوں کے لاکھوں مخطوطات آج ممالک یورپ
کی مشہور لائبریریوں کی زینت ہیں، اب ان کی فہرستوں کا پتہ بھی وہیں چلانا چاہئے،

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب   بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب،

میسور اور اودھ کی اسلامی سلطنتوں کو اگرچہ گردشِ دوراں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے لیکن
انکے کتبخانوں کا ذکر خیر باقی رہ گیا، ٹیپو سلطان کے شاہی کتب خانے کے دو ہزار مخطوطات کی ایک توضیحی
فہرست اسٹیورٹ نے ۱۸۰۹ء میں کیمبرج سے شائع کی، پھر اسپرنگر نے سلطنت اودھ کے آخری تا[illegible]
کے کتب خانہ کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع کی،

احاطۂ بمبئی میں اگرچہ عہد اسلامی جاہ و جلال، دولت و ثروت اور علم و ہنر کے لحاظ سے نہایت
شاندار گذرا ہے، اور ایک زمانہ میں گجرات کا دار الحکومت احمد آباد اور شاہانِ دکن کے پایۂ تخت
بیجاپور اور احمد نگر علم و ہنر کے مرکز تھے، جہاں بادشاہوں، امرا اور فضلا کے کتبخانوں میں ہزاروں
کی تعداد میں مخطوطات محفوظ تھے، لیکن افسوس دستبرد زمانہ سے ان کا شیرازہ بکھر گیا، ۱۸۵۳ء میں بیجاپور
کا شاہی کتبخانہ جو آثار محل میں محفوظ تھا، لندن منتقل ہو گیا، اگر اس مشہور شہر کے دوسرے کتبخانے تباہ ہو[illegible]
ہیں یہی حال احمد آباد اور احمد نگر کے کتبخانوں کا ہے،

پچیس سال کا عرصہ گذرا، جب بڑودہ میں میری آنکھوں کے سامنے ایک افسوسناک واقعہ

پیش آیا جس کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا، ایک یورپین سیاح قدیم نادر اشیا کی تلاش میں بڑودہ
آیا، ایک شریف زادہ جس کے بزرگوں نے مخطوطات کا ایک ذخیرہ جمع کیا تھا، معاش کی تنگی سے عاجز
آکر اسکو چار سو روپیہ پر اس یورپین کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا، سیاح وہ مخطوطات میرے
پاس لایا، اور کہنے لگا کہ انکی ایک فہرست بنا دو، مین نے اس کی فرمائش پوری کر دی، اس ذخیرہ
میں اگرچہ ایسے مخطوطات نہ تھے، جو شائع نہ ہو چکے ہون، لیکن فارسی کی بعض درسی کتابین نہایت
خوشخط اور باتصویر تھیں، ایک دن وہ سیاح میرے پاس ایک البم لیکر آیا، اور کہنے لگا، دیکھو ان
مخطوطات کی تصویروں کو کس طرح قینچی سے کتر کر مین نے ایک جا جمع کر دیا ہے، مین نے کہا تم نے بڑا
ظلم کیا، کہنے لگا وہ مخطوطات جہان تھے، عنقریب انکو کیڑے کھا جاتے، پھر ان میں کوئی ایسی کتاب نہ
تھی، جو شائع نہ ہو چکی ہو، اسلئے مین نے ان کی تصاویر کا یہ البم تیار کیا ہے جسمین چار سو روپیہ خرچ
ہوئے ہین، ان کے عوض اب مجھے پیرس میں چار سو پونڈ سے کہیں زیادہ رقم وصول ہوگی، میرا
بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر تھیلی بھاری،؛

گورنمنٹ بمبئی نے اگرچہ مخطوطات کے تحفظ کا انتظام کیا ہے، لیکن ان کے دورِ حکومت میں جب
قوم نے پر زور طریقہ سے اپنی آواز بلند کی، اسکی مراد بر آئی، چنانچہ سنسکرت کی ۲۲ ہزار مخطوطات گورنمنٹ
کی اعانت سے فراہم ہو کر پونہ کے بھنڈارکر انسٹیٹوٹ میں محفوظ ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے سلف صالحین
کی علمی یادگاریں اسی کس مپرسی کی حالت میں تباہ و برباد ہو رہی ہین،

غنیمت ہے کہ سابق دکن کالج کے نامور پروفیسر خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب ایم اے
کو اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ممدوح نے ۱۹۱۶ء میں مخطوطات کی فراہمی اور تحفظ کے لئے ایک عرضدا[illegible]
گورنمنٹ میں پیش کی، جو منظور ہوئی، اس طور سے شیخ صاحب نے مختلف مقامات سے ادب، تاریخ، ہیئ[illegible]
فلسفہ، ریاضیات، الٰہیات، اور دیگر فنون کے ۱۳۰ مخطوطات جن میں بعض نادر اور نایاب اور اکثر غیر مطبوعہ

تین ماہ کے اندر جمع کر دیئے، یہ ذخیرہ گورنمنٹ نے بمبئی یونیورسٹی کے سپرد کیا، جس نے اپنے نسخوں کو بھی شامل کر کے کل ۳۴۴ مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست شیخ صاحب سے انگریزی میں تیار کرا کے گذشتہ سال کے آخر میں بمبئی سے شائع کی،

ڈاکٹر ریو، ایتھے اور براؤن کی مشہور توضیحی فہرستیں دیکھنے کے بعد عام طور سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے، کہ فاضلانہ رنگ میں مستشرقین ہی فہرست نگاری کا حق ادا کر سکتے ہیں، لیکن شیخ صاحب جنھوں نے چراغ و بوریا والی قدیم مکتبی تعلیم کے ساتھ بمبئی یونیورسٹی کی صرف ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے، اور جو ہندوستان سے باہر جانا کیا معنی، مدراس اور لاہور بھی نہیں گئے ہیں، ایسی وسعتِ معلومات، تحقیق اور دقتِ نظر سے فہرست مرتب کرتے ہیں، کہ ہم ایسے پرانی لکیر کے فقیروں کو بھی حیرت ہوتی اگر لسان الغیب کا یہ شعر یاد نہ آتا، ؎

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد،

آج علمائے یورپ کی علمی تحقیقاتوں کو کون غلط ثابت کرے، جب کہ بقول علامہ شبلی مرحوم حالت یہ ہے،

یورپ اگرچہ زند آن نیز مسلّم باشد،

لیکن یہ شیخ صاحب کے آہنی قلم کی جنبش ہے، جس نے اس طلسم کو توڑا، اور ڈاکٹر ریو، ایتھے، براؤن وغیرہم مستشرقین کی غلطیوں کو درست کر کے تحقیق کی داد دی، ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں،:-

۱- انجار و اشجار، (فہرست صفحہ ۴۲)

یہ ایک نایاب نسخہ ہے، جو ابتک کہیں شائع نہیں ہوا، اس کا مصنف علی شاہ محمد بن قاسم الخوارزمی ہے، براؤن نے کتاب کے ایک مصرعہ "شش و ہفتاد و صد و بعد ہزار" سے سنہ تالیف ۱۱۷۶ھ

قیاس کیا، اسی سنہ کو نکلسن نے براؤن کے مخطوطات کی فہرست کیمبرج سے ۱۹۳۲ء میں شائع کرتے وقت درج کیا ہے، لیکن شیخ صاحب نے جب نسخہ کو غور سے پڑھکر مصنف کے حالات زندگی جو جستہ جستہ تحریر تھے، جمع کئے، پھر واقعات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا، تو معلوم ہوا، کہ ۶۹۶ھ مطابق ۱۲۹۶ء میں یہ کتاب تصنیف ہوئی کیونکہ اسوقت بخارا کے قتلِ عام کو جو ۶۸۱ھ میں آباقاخان کے حکم سے عمل میں آیا، پندرہ سال گذرے تھے، جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے،

شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ انجار و اشجار کا ذکر کشف الظنون میں موجود ہے، چونکہ کشف الظنون ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء میں تالیف ہوئی، اسلئے یہی ایک شہادت براؤن کی تردید میں کافی تھی، لیکن شیخ صاحب کی براہین طلب طبیعت کو صرف ایک شہادت سے کیا تسکین ہوتی، انھوں نے فہرست کے چار صفحوں میں شہادتیں جمع کر کے ایسے دلچسپ انتخابات نقل کئے ہیں، جن سے ضمناً دوسرے واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے، مثلاً انوری کی وہ مشہور طوفان باد والی پیشین گوئی جو غلط ثابت ہوئی، اور جو شاعر کی تحقیر و ذلت کا باعث ہوئی، اسکو مؤلف انجار و اشجار نے قرانات کے حساب سے چنگیز خان کی ولادت کا سال قرار دے کر طوفانِ چنگیزی سے تعبیر کیا ہے،

۲- نامۂ خیالات (فہرست صفحہ ۳۳)

ڈاکٹر ایتھے اور آئیوانو (روسی فاضل جو آج کل بمبئی میں فرقۂ اسمٰعیلیہ کے متعلق مصروفِ تحقیق ہے) دونوں نے امیر خسرو دہلوی کو اس کتاب کا مصنف قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کا دوسرا نام انشائے امیر خسرو ہے، جو اعجاز خسروی کے بعد لکھی گئی، لیکن شیخ صاحب نے کتاب کی داخلی شہادتوں سے ثابت کیا ہے، کہ مصنف نے ان خطوط میں جہاں رومی، نظامی، سنائی، عطار کے اشعار نقل کئے ہیں، وہاں حافظ، کاتبی، شاہی، ہلالی، اور طالب کلیم کے اشعار بھی درج کئے ہیں، حالانکہ آخر الذکر چھ شعرا، امیر خسرو سے بہت بعد گذرے ہیں، پھر ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ذکر بھی نامۂ خیالات میں موجود ہے، حالانکہ ابوالفضل کا انتقال

امیر خسرو سے ۲۰۶ برس بعد ہوا ہے، اسلئے نامۂ خیالات امیر خسرو کی تصنیف ہرگز نہیں ہے،

کتاب کا آغاز اس طور سے ہوتا ہے:۔

"عنوان نامۂ خیالات از مثنوی صاحب کمالات صوری و معنوی امیر خسرو دہلوی بہار است"

آئیونو اپنی فہرست میں کتاب کا نام بجائے نامۂ خیالات کے عنوان نامۂ خیالات لکھتا ہے، یہ ہے مستشرقین کی سخن فہمی!!

۳- مظہر العجائب (فہرست ص۹)

ڈاکٹر ریو، ایتھے، براؤن، اور آئیونو بالاتفاق کہتے ہیں، کہ یہ کتاب شیخ فریدالدین عطار کی سنِ کہولت کی تصنیف ہے، لیکن ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے مشہور پروفیسر محمود شیرانی نے رسالہ اردو اورنگ آباد کے جنوری نمبر میں ایک فاضلانہ مضمون لکھکر کتاب کی اُنہیں داخلی شہادتوں سے ثابت کر دیا کہ شیخ عطار کی طرف اس کتاب کو منسوب کرنا ایک افترائے عظیم ہے، شیخ صاحب نے اسی مضمون کی شہادتوں کو انگریزی کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے!

اصل یہ ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز میں جب شاہ اسمٰعیل صفوی نے اثنا عشریت کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا، تو در پردہ یہ بھی کارروائی کی گئی، کہ مشہور شعراء اور فضلاء کی طرف ایسی تصانیف منسوب کر دی گئیں جن سے ان کا مذہب تشیع کا حامی اور خلفائے ثلثہ کے سب و شتم کا قائل ہونا ثابت کیا جا سکے، چنانچہ ایک ہی صدی کے اندر یہ حالت ہو گئی، کہ عہدِ جہانگیر میں قاضی نور اللہ شوستری نے اپنی کتاب مجالس المؤمنین میں اکثر مشہور سلاطین علماء و فضلاء اور شعراء کو شیعہ اثنا عشریہ لکھدیا، اور بعض کتابیں جنمیں غلو کیساتھ تشیع کی تعلیم تھی، ان کی جانب منسوب کر دیں، مثلاً سر العالمین، امام غزالی کی طرف، اور مظہر العجائب، شیخ عطار کی طرف وغیرہ وغیرہ، حیرت ہے کہ وہ عطار جسکو عارفِ روم سے

"عطار روح بود و سنائی دو چشم ما"

کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ عطار جس کا توحید و عرفاں میں ڈوبا ہوا سچا مسلک تنگ نظر ظاہر بین فرقہ پرستوں سے یوں خطاب کرتا ہے:۔

تو علیؓ دانی و بوبکرؓ اے پسر، وز خدا و عقل و جانی بے خبر
یا چو ایشاں جاں فشاندن پیشہ گیر، یا خموش و ترک ایں اندیشہ گیر

(کاش ہمارے لکھنؤ کے شیعہ اور سنی بھائی اس پر غور کرتے!)

وہ عطار جو عشق حقیقی کے درد سے بیتاب یوں دعا کرتا ہے، سے

کفر کافر را و دیں دیندار را، ذرۂ دردت دلِ عطار را،

وہی عطار مظہر العجائب میں آسمانِ سخن سے اتر کر عامیانہ تبرا بازی کی خندق میں گر پڑے، مستشرقین اس نکتہ کو کیا سمجھتے، لیکن مرزا عبد الوہاب قزوینی جو پروفیسر براؤن کے دست راست رہے ہیں، وہ بھی حق پوشی کر گئے، اگرچہ دبی زبان سے اسقدر تو لکھنے پر مجبور ہو گئے،

"اشعار ایں کتاب بالنسبۃ بسائر اشعار عطار تفاوت واضح دارد و در پستی و سستی و قدرے رکاکت، و ہر کس منطق الطیر و الٰہی نامہ و خسرو و گل، و دیوان عطار را مطالعہ کردہ باشد برائے او قدرے مشکل است اعتقاد کند، کہ صاحب مظہر العجائب با آنہا یکے بودہ است"

(دیباچہ تذکرۃ الاولیاء مرتبہ نکلسن)

۴- قصیدہ مصنع (فہرست ص۱۵)

قوامی کے مشہور قصیدہ مصنع میں حسب ذیل شعر

چیست آں دور و اصل او نزدیک چیست آں فرد و فعل او بسیار،
خام او ہر چہ علم را پختہ، مستِ او ہر چہ عقل را ہوشیار!

پروفیسر براؤن سے حل نہ ہو سکا، اسی طرح صنعت مجرد بھی جو اس قصیدہ کے شعر نمبر ۶ میں

پائی جاتی ہے، ممدوح کی سمجھ میں نہیں آئی، شیخ صاحب نے دونوں کو حل کیا ہے، مذکورۂ بالا شعر سے "عشق" نکلتا ہے، اور صنعت مجرد سے یہ مراد کہ حروف تہجی کے کسی ایک حرف کو لیکر یہ التزام رہے کہ وہ حرف شعر میں نہ آنے پائے، چنانچہ قوامی کے قصیدہ مصنّع کے شعر نمبر ۱۰ میں حرف الف کو خارج کیا ہے،

پروفیسر براؤن جہاں کچھ نہیں سمجھے، عالی ظرفی سے اپنے قصور فہم کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن ڈاکٹر ایتھے فارسی دانی کے اظہار میں بُری طرح ٹھوکر کھاتے ہیں، انڈیا آفس کی فہرست میں جہاں ہفت اقلیم امین رازی کا تذکرہ کیا ہے، ملاحظہ ہو،

قاضی زادہ کرہرود موسوم بہ قاضی جہان کو حضرت علی مرتضٰیؓ کی شان میں گستاخی کے باعث شاہ طہماسپ صفوی قید کرتا ہے، اصل عبارت یہ ہے کہ "قاضی جہان نسبت بہ شاہ اولیا استخفاف ورزید" ڈاکٹر ایتھے شاہ اولیا کو شاہ طہماسپ سمجھتے ہیں، پھر لکھتے ہیں، :- کہ قاضی جہان بادشاہ کی شان میں گستاخی کے باعث قید ہوا، حالانکہ اہل علم پر پوشیدہ نہیں ہے، کہ شاہ اولیا سے مراد حضرت علی مرتضٰیؓ ہیں، شاہ طہماسپ کے عہد میں اکثر سنی شعرا، اور علماء کو جنھوں نے حضرات شیخینؓ کی تعریف میں غلو سے کام لیکر حضرت علی مرتضٰیؓ کا ذکر بے ادبی سے کیا سزا دی گئی ہے،

اسی طرح تبریز کے قاضی امیر عبد القادر کے قتل کی تاریخ ڈاکٹر ایتھے نے

"آہ شہید میر عبد القادر"

سے ۹۰۷ھ نکالی، پھر لکھتا ہے، یہ تاریخ غلط ہے، کیونکہ قاضی مذکور کا قتل ۹۰۹ھ میں واقع ہوا شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ آہ میں الف ممدودہ کے ۲ اور میر کو امیر پڑھنا چاہئے، تب ۲ کی کمی پوری ہو جاتی ہے، اور آہ شہید امیر عبد القادر سے ۹۰۹ھ نکل آتے ہیں، شیخ صاحب کی یہ اصلاح درست ہے لیکن اپنی فہرست کے صفحہ ۷۰ میں مولینا امیدی کی تاریخ شہادت میں جو اصلاح دی ہے وہ صحیح نہیں ہے امیدی کے شاگرد نامی نے مصرعۂ ذیل :-

آہ از خون ناحق من آہ،

سے استاد کی تاریخ قتل نکالی تھی، ڈاکٹر ایتھے لکھتے ہیں، کہ اس مصرع سے ۹۲۵ھ نکلتے ہیں، حالانکہ امیدی کا قتل ۹۲۰ھ میں واقع ہوا، اسلئے مصرعہ میں غلطی ہے، شیخ صاحب نے مصرعۂ بالا کو یوں بدلا اور ایتھے کی طرح الف ممدودہ کا ایک شمار کر کے

آہ زخون ناحق من آہ آہ

سے ۹۲۰ نکالے ہیں، لیکن شیخ صاحب کو یہ علم نہ تھا، کہ حال میں صفویوں کی قدیم تاریخ کا ایک نادر نسخہ احسن التواریخ مصنفہ حسن روملو (ولادت ۹۳۷ھ) مسٹر سڈن نے گائیکوار سیریز میں شائع کیا ہے، (اسکے پروف میں نے دیکھے ہیں،) اس کتاب کے ص ۱۷۰، میں ۹۲۹ھ کے واقعات کے تحت میں مولینا امیدی طہرانی کا ذکر ہے، اور نامی کی پوری تاریخ اس طور سے درج ہے،

نادر العصر امیدی مرحوم چو بناحق شہید شد ناگاہ،
شب بخواب من آمد و میگفت کاے ز حال درون من آگاہ؛
بہر تاریخ قتل من بنویس آہ از خون ناحق من آہ،

آخری مصرعہ سے ۹۲۷ نکلتے ہیں، ۲ کا تعمیہ مصرعۂ ماقبل سے اس طور سے ۹۲۹ھ ہوتے ہیں

شیخ صاحب نے اپنی فہرست کے چالیس صفحوں میں ہفت اقلیم کے ایک حصہ کا ملخص انگریزی میں درج کیا ہے، اور اگر یونیورسٹی کی طرف سے یہ بندش نہ ہوتی، کہ فہرست آکیو وغیرہ مستشرقین کے اتباع میں تیار کیجائے، تو وہ دوسرے نایاب نسخوں کا جو اب تک شائع نہیں ہوئے، منتخب ترجمہ داخل فہرست کرتے، پھر بھی انھوں نے فردوسی کے متعلق مفید معلومات درج کئے ہیں، محمود شبستری کی گلشن راز اور عرفی کے کلیات کی مختلف شرحوں کا حوالہ دیا ہے، اور پارسیوں کے قصۂ سنجان اور روایات پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے، صائب کا کلیات جس پر سنہ کتابت ۵ ذی الحجہ ۱۰۸۱ھ درج ہے، اس کے اس صفحہ کا فوٹو دیا ہے جس پر خود صائب کے

کے قلم سے تین غزلیں حاشیہ پر "لراقمہ" کے تحت میں درج ہیں، (دیکھو فہرست ص۱۲۵) اسی طرح فہرست کے
صفحہ ۱۰، میں دیوان ظہوری کے ایک صفحہ کا فوٹو دیا ہے، جس پر ظہوری کے قلم سے ایک غزل درج ہے،
اس دیوان کی یہ خصوصیت ہے، کہ اسکی نظر ثانی خود ظہوری نے کی، اور اپنے قلم سے چند غزلیں بھی لکھیں،
اس نسخہ میں بہت سی رباعیاں بھی ہیں، جو مطبوعہ دیوان ظہوری میں حذف ہیں،

دیوان ابن یمین (دیکھو فہرست ص۵۴)

علمائے مشرق و مغرب بالاتفاق کہتے ہیں، کہ ابن یمین کی زندگی ہی میں ان کا دیوان سربداران
کے ہنگامہ ۷۴۳ھ میں ضائع ہوگیا، یہ افسوسناک واقعہ صحیح ہے، لیکن ادب کے شائقین کو یہ معلوم کرکے
خوشی ہوگی، کہ شیخ صاحب کو دوسرا دیوان جسے خود ابن یمین نے ہنگامہ مذکورہ بالا کے دس برس
بعد جمع کیا تھا، بجا پورسے ہاتھ آگیا، اس کے ثبوت میں "رسالہ احوال ابن یمین" مولفہ رشید یاسمی مطبوعہ
طہران ۱۳۰۳ھ سے ابن یمین کی حسب ذیل عبارت جو اسکے دیوان کے دیباچہ میں درج تھی نقل کی ہے،

دیریست کہ اندیشۂ آن دارم باز گردور فلک نہ دار دازکارم باز
کاشعار پراگندہ چو ہفت اور نگم مانندۂ پروین بنظام آرم باز،

الغضہ بطور لمابیتے چند از ان کہ پیشتر گفتہ شدہ بود، از جرائد افاضل نامدار و سفائن اماثل
روزگار التقاط کردہ شد، وانچہ بعد از ان اتفاق افتاد، بر ان الحاق کردہ آمد، و دیوان
دیگر چنان کہ آید نہ چنان کہ باید در سلک کتاب منتظم گشت، ... و جری ذالک غرۂ شوال
بثلث و خمسین و سبعمائۃ والحمد بوبیہ"

۱۸۵۲ء میں ڈورن نے سینٹ پیٹرس برگ کے کتب خانہ کے مخطوطات کی فہرست ص۳۵۸ میں لکھا تھا
کہ اس نسخہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن یمین نے خود یہ دیوان ۷۵۶ھ میں ترتیب دیا، لیکن ڈاکٹر
ایتھے نے دعوی کیا کہ یہ غلط ہے، پھر کتب خانہ بانکی پور کے فہرست نگار مولوی عبد المقتدر نے ڈاکٹر

ایتھے کی تائید کی، اور لکھا کہ غالباً ابن یمین کے کسی دوست نے اسکو جمع کیا ہوگا، یہ اسلئے کہ ڈاکٹر ریو اور
ایتھے کے نزدیک ابن یمین کی وفات جیسا کہ اکثر تذکروں میں درج ہے ۷۴۵ھ لکھی ہے، شیخ صاحب
کہتے ہیں کہ سب سے قدیم ماخذ فصیحی کا مجمل ہے، جسے براؤن نے نقل کیا ہے، اس میں ابن یمین کی تاریخ
۸ رجمادی الثانی ۷۶۹ھ درج ہے، اسی تاریخ کو اعتماد السلطنۃ نے اپنی منتظم ناصری میں نقل کیا ہے،
شیخ صاحب نے اور ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے، لکھتے ہیں کہ شعر العجم جلد دوم ص۲۴۱ میں آزاد کی یدبیضا سے حسب
ذیل تین شعر نقل ہوئے ہیں،

سر بدہ اے دیدہ ہر دم اشک غماز مرا ۱ تا نسازد فاش پیش مردمان راز مرا
ز خود بیگانہ بودن در رہ عشق ۲ بر آن معشوق طرح آشنائی ست
عشق تا در دلی آمد نہ در آمد نہ نمود ۳ بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستان نہ رسید

یہ تینوں اشعار اس نسخہ میں موجود ہیں، تیسرا شعر اس طور سے درج ہے، اور یہی
صحیح ہے،

عشق تا در دل آدم نہ در آمد نہ نمود بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستان نہ رسید

ہشت بہشت (فہرست ص۹۵)

ترکان آلِ عثمان کی یہ سب سے قدیم تاریخ ہے، جس کا مصنف حکیم الدین ادریس ابن
حسام الدین علی بدلیسی ہے، ۹۱۲ھ میں سلطان بایزید ثانی کے حکم سے اس نے یہ تاریخ نثر فارسی
میں تاریخ گزیدہ اور وصاف کے طرز پر لکھی، جس میں ۶۰۱ھ سے ۹۰۸ھ تک کے حالات قلم بند ہیں، آٹھ
سلاطین کا اسمیں ذکر ہے، اس مناسبت سے ہشت بہشت نام رکھا، دوسرا نام کتاب الصفات الثمانیہ
فی اخبار القیاصرۃ العثمانیہ ہے، یہ تاریخ آٹھ کتیبہ یا دفتر میں منقسم ہے، ہر کتیبہ میں ایک سلطان کا تذکرہ
عثمان بیگ غازی (۶۹۹ھ تا ۷۲۶ھ) سے شروع ہو کر سلطان بایزید ثانی (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ) پر ختم

ہوتی ہے، ترکانِ آلِ عثمان کی تاریخ کے اس قدیم ماخذ کے صرف تین کامل نسخے یورپ میں موجود ہیں، شیخ صاحب کو کتبۂ مفتم ملا ہے، جس میں صرف ۲۶۰ ورق ہیں، اور ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں، حالانکہ یہ ایک بہت ضخیم تاریخ ہے، اسکی ضخامت کا حساب عجیب طور پر ہے، عموماً قدیم نسخوں میں اوراق وصفحات کا شمار درج ہوتا ہے، یا پاورق میں صفحۂ آیندہ کا پہلا لفظ لکھ دیتے ہیں، لیکن ہشت بہشت میں بیت سے شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اسمیں اسّی ہزار بیت ہیں، شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ بدلیسی میں کلیمنٹ ہوارٹ لکھتا ہے، کہ ہشت بہشت میں اسّی ہزار اشعار (ورس) ہیں حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے، مولینا روم کی کتاب فیہ مافیہ جسے مولینا عبد الماجد نے شائع کیا، اسکے متعلق بھی نکلسن نے لکھ دیا تھا، کہ اس میں تین ہزار ورس ہیں، حالانکہ وہ نثر ہے،

انگریزی میں اگرچہ ورس نظم اور نثر دونوں کے لئے مستعمل ہے، (دیکھو نیو اسٹینڈرڈ ڈکشنری جلد چہارم ص ۲۶۴۵) اسی لئے قرآن مجید اور اناجیل کے آیات کو ورس لکھتے ہیں، حالانکہ وہ نثر میں ہیں، لیکن بیت کا ترجمہ ورس کرنا خالی از اشتباہ نہیں، مستشرقین کو چاہئے تھا کہ ہشت بہشت اور فیہ مافیہ کے بیت کیلئے لائن لکھتے نہ ورس،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین عثمانیہ کے قلمرو میں قدیم نسخوں میں سطروں کا شمار کرکے ان کو بیت کہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہشت بہشت میں اسّی ہزار بیت ہیں، اب اگر ہر صفحہ میں مثلاً بیس سطریں لکھی جائیں تو کامل نسخہ چار ہزار صفحات کا ہوتا ہے، اسی طرح فیہ مافیہ میں تین ہزار بیت ہیں، جسکے ڈیڑھ سو صفحات ہوئے،

ہشت بہشت کا ناتمام نسخہ شیخ صاحب کو بیجاپور سے ملا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف عادل شاہ بانی سلطنت بیجاپور جو سلطان مراد (وفات ۸۵۴ھ) کی اولاد میں سمجھا جاتا تھا، (دیکھو فرشتہ مقالہ سوم روضہ دوم) اور جس نے ۸۹۵ھ سے ۹۱۶ھ تک حکومت کی اس کے زمانہ میں یہ نسخہ ہندوستان آیا، کیونکہ ہشت بہشت کا سال اختتام ۹۱۲ھ ہے، شیخ صاحب کو ساتواں کتبہ ملا ہے جس میں سلطان

محمد ثانی (وفات ۸۸۶ھ) کا تذکرہ ہے، یعنی یوسف عادل شاہ کے بڑے بھائی کا،

شیخ صاحب کو بعض ایسے نایاب نسخے بھی مل گئے ہیں، جو نہ ابتک شائع ہوئے ہیں، اور نہ یورپ کے مشہور کتبخانوں کی فہرستوں میں ان کا ذکر ہے، ان میں منشآتِ شاہ نواز خان خصوصیت کیساتھ قابلِ ذکر ہے، (دیکھو فہرست ص۱۱)

اس نسخہ کے سرورق پر "مجموعۂ خطوط" لکھا تھا، اور دیباچہ کے ابتدائی چند اوراق گم، لیکن شیخ صاحب نے خطوط کو غور سے پڑھکر تاریخی واقعات، اسماء اور مقامات سے پتہ چلایا کہ مآثر الامراء کے مشہور مصنف نواب عبد الرزاق شمس الدولہ شاہنواز خان وزیر نظام الملک آصفجاہ وناصر جنگ کے خطوط کا یہ مجموعہ ہے، غلام علی آزاد نے دیباچۂ مآثر الامراء میں جہاں شاہ نواز خان کی سوانحِ حیات لکھے ہیں، لکھا ہے:-

"منشی بے بدل بود وانشاء او در خطوط نویسی طرز خاصے دارد حیف کہ منشآتِ او جمع نشد، اگر تدوین می یافت چشم ناظران را کحل الجواہر می کشید"،

لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ بعد کو کسی نے یہ مختصر مجموعۂ خطوط جمع کیا ہے، جیسا کہ اس نسخہ کے آغاز میں تحریر ہے،

"اگرچہ تحریرات ش بسیار زیادہ ازین مجموعہ مختصر بودہ، امابالفعل ہرچہ فراہم شد ثبت افتاد"

شاہ نواز خان دولت آصفیہ حیدرآباد کے وزیر تھے، برار کے دیوان بھی رہے، ولادت ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۷۰۰ء، ساٹھ برس کی عمر میں بمقام اورنگ آباد شہید ہوئے،

مجموعہ کے اکثر خطوط تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، اور اس عہد کی جو کچھ سیاست پر جب انگریز فرانسیسی پیشوا اور نظام آپس میں لڑتے تھے، روشنی ڈالتے ہیں، یہ اس قابل ہیں، کہ ان کے شائع کرنے کی جلد کوئی سبیل نکالی جائے، ایک صورت یہ ہے کہ شاہِ دکن اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی سلور جبلی عنقریب ہونے والی ہے، اگر ہمارے محترم بزرگ مولینا نواب صدر یار جنگ بہادر کوشش فرمائیں

تو امید قوی ہے، کہ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے جشن سیمیں کی ایک یادگار بگ موریل سیریز کے طور پر قائم ہو جائے، اور نایاب اور نادر الوجود مخطوطات کے شائع کرنے کا انتظام خواہ جوبلی فنڈ کی ایک رقم سے یا نیا فنڈ قائم کرنے سے ہوسکے اور اسی کے ساتھ ایک فہرست اُن نادر اور نایاب مخطوطات کی جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہوں، اور اب تک کہیں شائع نہ ہوئے ہوں تیار کی جائے، اس کام کے لئے شیخ صاحب نہایت موزوں ہیں،

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں ہندوستان کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہو جاتا ہے، مولنا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہو کہ انکا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت:- ۱۲ر

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتے، مولوی ابو الحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تلاش وتحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا، اور جسکو اہلِ نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، کتاب مصنف کے ذوق تحقیق کی آئینہ دار ہے، اور مفید اور پر از معلومات ہے، ضخامت ۱۳۴ صفحات، قیمت ۱-۱۲ر

"منیجر"

اسلامی علم جغرافیہ کے نظریے

از

جناب صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

"معارف جلد ۲۵ میں "مسلمان جغرافیہ دان" کے عنوان سے ماہ مئی ۱۹۳۰ء سے ایک سلسلہ مضمون شائع ہونا شروع ہوا تھا جو فرانسیسی مستشرق کارادو وو (Carrade Vaux) کی کتاب حکمائے اسلام (Penseurs de l'Islam) جلد دوم سے ماخوذ تھا، لیکن افسوس کہ بعض وجوہ سے اسکے صرف چند نمبر چھپ سکے تھے، اب ہمارے دوست پروفیسر صوفی غلام مصطفٰے تبسم نے اس سلسلہ کی مزید کڑیاں ہیں فرانسیسی زبان سے ترجمہ کر کے عنایت کی ہیں، جو ذیل میں پیش ہیں"

"سب اڈیٹر"

عرب جغرافیہ نگار مولف جامع اخبار اور بسا اوقات اہل مشاہدہ ہونیکی حیثیت کر اپنی سادہ بیانی میں ممتاز ہیں تاہم وہ چند جغرافی نظریے رکھتے ہیں جنھیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں،

زمین کی گولائی، ان کے نظریہ کا پہلا اصول زمین کی گولائی ہے، اس عقیدہ کی ابتدا فیثا غورس سے ہوئی، اور چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط میں یہ نظریہ تقریبًا سب لوگوں میں پھیل گیا، قدما نے اسکے ثبوت میں بہت سے دلائل پیش کئے ہیں، جو آجکل بالکل عجیب معلوم ہوتے ہیں، وہ طریق استدلال استخراجی ہے، مثلاً زمین نہ تو مسطح ہو سکتی ہے اور نہ کھوکھلی، نہ مکعب ہے اور نہ مخروطا اسلئے یہ گول ہے، یہ استدلال پوسی ڈونی اس (Posidonius) کا ہے، اور بطلیموس اسی کا تتبع کرتا ہے، اس کے علاوہ

بطلیموس، کلومید (Clomede) اور تھیون (Theon) کی طرح ایک قرین قیاس دلیل بھی پیش کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ماورائے افق اشیا مثلاً پہاڑ، جہاز کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن یہ بات زمین کے محدب ہونے پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ مدور ہونے پر، ارسطو اس سے زیادہ قرین صحت دلیل پیش کرتا ہے، اگرچہ وہ مقبولِ عام نہ ہوئی، وہ یہ کہ کسوف میں زمین کا سایہ سطح ماہ پر ہمیشہ گول ہوتا ہے،

عربوں میں سے ابوالفدا زمین کے مدور ہونے کی ہیئتی دلیل پیش کرتا ہے، مشرق میں ستارے جلدی طلوع اور غروب ہوتے ہیں، جب کوئی شخص شمال کی جانب بڑھے، تو قطب اور شمالی ستارے طلوع ہوتے ہیں، اور اسی طرح اگر کوئی جنوب کی طرف بڑھے، تو جنوبی قطب اور ستارے نظر آنے لگتے ہیں، اور جتنا زیادہ سفر کیا جائے اتنی ہی زیادہ یہ بات واضح ہوتی ہے، یہ عرب جغرافیہ نگار لکھتا ہے، کہ پہاڑوں اور نچائیوں کا وجود زمین کی گولائی میں حارج نہیں ہوتا، یہ چیزیں زمین کی وسعت کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں،،۔

"ہیئت داں ثابت کر چکے ہیں، کہ آدہ فرسنگ اونچا پہاڑ کرۂ ارض کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو جو کے دانے کے پچیسویں حصے کو ایک ذراع قطر والے کرہ سے ہو سکتی ہے"

قدما اور خاصکر تھیون کا بھی یہی بیان ہے، قدما اور عرب دونوں کا یہ خیال ہے کہ زمین کرات سماوی کے مقابلے میں صرف ایک نقطہ ہے، یہ بیانات ان احساسات کا آئینہ ہیں، جو مختلف کرات کے باہمی تفاوت بعد و حجم کو معلوم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، اسی مسئلہ تفاوت کا پورا پورا حل بعد میں حساب جزئیات (Differential calculus) سے کیا گیا، ابوالفدا کا وہ بیان جس میں وہ تین آدمیوں کے واپسی پر ایک جگہ ملنے کا ذکر کرتا ہے، بلاشبہ ایک نیا خیال ہے، ان تینوں آدمیوں میں سے دو کرۂ ارض کے سفر کیلئے روانہ ہوتے ہیں، ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب اور تیسرا شخص اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، جو شخص مغرب کی جانب روانہ ہوتا ہے، وہ اپنے مکمل دورے میں

ایک دن بچا لیتا ہے، مثلاً وہ اپنے خیال میں جائے روانگی پر جمعرات کو پہنچا ہے، تو دراصل وہ جمعہ کا روز تھا، ۱۵۲۲ء میں اس امر کی تجربتہً تحقیق کی گئی، جب سبٹین دل کینو (Sebastian del cano) مگین (Magellan) کا ساتھی تین سال کے سفر کے بعد مغرب کی جانب سے روانہ ہو کر مشرق کی جانب سے اسپین واپس آیا، قدما کی طرح عرب بھی یہی سمجھتے تھے کہ زمین کے گرد خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد، ایک سمندر محیط ہے، ان کا بلاشک یہ خیال تھا کہ یہ سمندر ایک بڑا گول دریا ہے، وہ اسکو بحر محیط کہہ کر پکارتے تھے، یعنی جو سمندر احاطہ کئے ہوئے ہو، یہ ایک قدیم خیال ہے، اور ان لوگوں کے عقیدے کے زیادہ مطابق و مناسب ہے، جو زمین کو ایک تیرتا ہوا قرص سمجھتے ہیں، بہ نسبت اس عقیدے کے جو اسکو ایک کرہ سمجھتے ہیں، ہومر سمندر کو ایک دریا سے تشبیہ دیتا ہے، جو زمین کے گرد احاطہ کئے ہوئے ہے، الحاصل یہ ایک ایسا خیال ہے جسکی بنیاد افسانوں پر ہے، اور جو ترقی یافتہ علم کے زمانہ تک قائم رہا ہے،

کرۂ ارض کی تقسیم، قدما نے کرۂ ارض کو خط سرطان، خط جدی اور دائرۂ قطبی کے ذریعہ پانچ منطقوں میں تقسیم کیا تھا، جس طرح اب بھی کیا جاتا ہے، پوسی ڈونی اس ان منطقوں کے اختراع کو پرمی نائڈ (Parmenide) کی طرف منسوب کرتا ہے،

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جغرافیہ نگار اس تقسیم کی طرف زیادہ مائل نہ تھے، بلکہ وہ اقالیم کی تقسیم کو استعمال میں لاتے تھے، اقالیم کی تقسیم ارتستھینس (Erotosthenes) کی کی ہوئی ہے، ان اقالیم کو عرض بلد کے ذریعہ ظاہر نہ کیا جاتا تھا، بلکہ سال کے بڑے سے بڑے دن کے طول کے ذریعہ، چنانچہ مارو (Maroe) (مصر) میں سب سے بڑا دن تیرہ گھنٹے کا ہوتا ہے، سین (Syene) میں ساڑھے تیرہ گھنٹے کا اور اسکندریہ میں چودہ کا، اسلئے اقالیم کی وسعت غیر متعین ہے،

طول بلد و عرض بلد، ابوالفدا ابھی اقالیم کے حدود قائم کرتا ہے، ہر اقلیم کے کنارے اور وسطی علاقہ پر سب سے بڑے دن کے طول کو، اور ساتھ ہی اسکے متعلقہ عرض بلد کو بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن اس نے اپنی کتاب کو

اقالیم کے لحاظ سے تقسیم نہیں کیا، یعقوبی نے بھی اس سے بڑھکر کچھ نہ کیا، ادریسی اسکے خلاف چلا، اور متعدد جغرافیہ نگار اسی نظام کے پابند رہے، عربوں نے اقالیم کے خیال کو بطلیموس سے لیا، جس نے اروسٹنیز کی تقسیم میں کسی قدر تغیر کر لیا، (کرونومیٹر) کی ایجاد سے پہلے طول بلد کا صحیح اندازہ لگانا نہایت دشوار امر تھا، طول بلد کو معلوم کرنے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ دو بعید الفاصلہ مقاموں مثلاً روڈ اور اسکندریہ میں کسوف مہر و ماہ یا کسوف نجم (ستارہ) کے مشاہدہ کرنے اور اس واقعہ کے دونوں جگہ ظہور پذیر ہونے کے وقت کو لکھ لیتے، جو فرق ان دونوں وقتوں میں ہوتا، وہ دونوں مقاموں کے نصف النہار کا فرق سمجھا جاتا، اروسٹنین کی کتاب میں یہی طریقہ پایا جاتا ہے، ہپارکس (Hipparchus) اور بطلیموس نے بھی یہی طریقہ استعمال کیا ہے، موخر الذکر نے بھی مقدم الذکر کے وقت کے متعلق مشاہدات کی مدد سے طول بلد نکالا ہے، اس کے بعد لوگ اگر کسی جگہ کے مقام کو قائم کرنا چاہتے، تو اس جگہ اور کسی دوسری جگہ سے جس کا طول البلد پہلے سے معلوم ہوتا، درمیانی راستون کے فاصلہ کا اندازہ لگا کر قائم کرتے، دراصل قدما نے براہ راست بہت کم طول بلد معلوم کئے، سڑکوں (راستوں) کے فاصلون کا تخمینہ بہت مشکوک ہوتا، بطلیموس نے عرض بلد اور طول بلد میں بڑی بھاری غلطیاں کی ہیں، قدما، کا ابتدائی خط نصف النہار کے انتخاب میں اختلاف ہے، ہپارکس نے اپنے وطن روڈس کے خط نصف النہار کو ابتدائی مانا ہے، بطلیموس نے اس خط نصف النہار کو ابتدائی انتخاب کیا ہے، جو دنیا کے مغرب میں جزائر خالدات سے گذرتا ہے،

عربوں نے اس معاملہ مین کوئی نمایاں علمی ترقی نہیں کی، وہ اسی قدیم طریقے کو جو مشاہدہ کسوف پر مبنی تھا، مانتے تھے، طول بلد کو انھوں نے بطلیموس کی کتاب جغرافیہ اور ایک دوسری کتاب سے لیا ہے، جو جغرافیہ بطلیموس کی نقل معلوم ہوتی ہے، اور جس کا نام روئداد ربع مسکوں ہے، ان کے ایسے نقشوں میں جن کا ہمیں علم ہے، خطوط نصف النہار موجود نہیں تاہم ہم دیکھتے ہیں، کہ بڑے بڑے مسلمان جغرافیہ نگار

صحیح طول بلد کے دینے کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں، گمان ہے کہ یہ خطوط اس مسطح مدور پر ضرور ہونگے جو ادریسی نے روجر شاہ صقلیہ کیلئے تیار کیا تھا، ادریسی اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے، :-

"بادشاہ قطعی طور پر یہ دریافت کرنا چاہتا تھا، کہ مختلف جگہوں کا طول بلد اور عرض بلد، اور ان کا فاصلہ کیا ہے، اس کے لئے اس نے ایک تختی سی تیار کی تھی، جس میں اوس نے مقیاس کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ایسے خطوط ظاہر کئے تھے، جو مختلف کتابوں میں درج تھے، او جن پر لوگوں کا اتفاق تھا، اور جو مختلف مصنفین کی آرار کا مقابلہ کر چکنے پر درست ثابت ہوئے تھے؛"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامات کو مسطح مدور پر ان کے درمیانی فاصلوں کا اندازہ کر کے لکھتے تھے، اس کے بعد ان کی جاے وقوع کے لحاظ سے جو نقشہ پر ظاہر کی گئی تھی، اون کا طول بلد نکالا جاتا تھا،

البیرونی کی کتاب قانون میں بڑے بڑے شہروں کے طول بلد کا نقشہ دیا ہوا ہے، وہ ان کی تصحیح کرنے پر فخر کرتا ہے، لیکن اس کے بیان کے مطابق یہ اصلاحات اس کے اپنے مشاہدات کا نتیجہ تھیں، وہ پرانے کاغذات کے مندرجہ اعداد میں باہمی مناسبت و ترتیب پیدا کرنے پر قانع نظر نہیں آتا ہے، وہ لکھتا ہے، :-

"میں نے مختلف جگہوں کے طول بلد اور عرض بلد، بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے مشاہدات کے ماتحت جانچ کر کے لکھے ہیں، میں نے پرانی کتابوں کا محض تتبع نہیں کیا، بلکہ ان جگہوں کا باہمی فاصلہ دریافت کر کے خود تحقیق کی ہے، کیونکہ قدیم کتابوں میں بعض غلطیاں موجود ہین، بعض مصنفین طول بلد کا آغاز جزائر خالدات سے کرتے ہین، اور بعض سمندر کے مغربی ساحل اقصیٰ سے اسی طرح بعض ایسے ہیں، جو مشرق سے شروع کرتے ہیں، اس موخر الذکر طریق کا نتیجہ سوائے اسکے

اور کچھ نہیں کہ وہ مغربی ساحل سے شروع کرنے والوں کے نتائج کا محض تتمہ ہوتا ہے،

ابو الفدا نے بیرونی کے نقشہ سے بہت استفادہ کیا ہے، تاہم وہ اس غلطی سے بچ نہ سکا، جسکو البیرونی نے واضح کیا تھا یعنی وہ کبھی طول بلد کے جزائر خالدات کے خط نصف النہار کے اعتبار سے نکالتا ہے، اور کبھی افریقہ کے انتہائی مغربی ساحل سے، ابو الفدا نے چند جگہوں کا عرض بلد ایک آلہ کے ذریعہ دریافت کیا تھا جس کو وہ قیاس کے نام سے پکارتا ہے، رینو اس لفظ کا ترجمہ استقرار کرتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے معنی مسطر یا پرکار کے زیادہ موزوں ہیں، (ادریسی کے مذکورۂ بالا بیان میں لفظ مقیاس سے مقابلہ کرو) اس نے ایک پرانے نقشہ پر پرکار یا مسطر کے ذریعہ خطوط طول البلد کھینچے، وہ لکھتا ہے کہ اس نے ان تمام مقامات کی تحقیق کی ہے، جو اس کے وطن حماۃ کے طول بلد پر واقع تھے، اس نے فرس (Fares) نامی ایک شخص کی تصنیف کتاب الاطوال (یعنی کتاب طول بلد اور عرض بلد) سے استفادہ کیا تھا، اور ہسپانیہ کے مشہور و معروف جغرافیہ نگار ابن سعید مغربی کی تصنیف کو بھی دیکھا تھا، (سنہ ۶۱۰ھ تا سنہ ۶۷۳ھ)

دائرۂ نصف النہار کی پیمائش عرب علما نے ایک نہایت لطیف علمی مشاہدہ کیا تھا، وہ دائرۂ نصف النہار کی پیمائش تھی، وہ چاہتے تھے کہ بطلیموس کی پیمائش کی تحقیق یا تصحیح کریں،

قدیم زمانہ میں کرۂ ارض کے محیط دائرہ کی پانچ مختلف پیمائشیں کی گئی تھیں، پہلی ارسطو کی، (جو غالباً یوڈوکس (Eudoxe) کی ہوگی،) وہ زمین کے دائرہ کو ۴۰۰۰۰۰ فرلانگ بتاتا ہے، دوسری ارشمیدس کی جو آرینیر (Arenaire) میں درج ہے اور ایک مصنف کے قول کے مطابق جس کا نام ارشمیدس نے لکھا، ۳۰۰۰۰۰ فرلانگ ہے، تیسری اراٹوستینس کی ۲۵۲۰۰۰ فرلانگ تقریباً ۷۰۰ فرلانگ فی ڈگری، چوتھی پیمائش پوسیڈونیس کی ۲۴۰۰۰۰ فرلانگ اور پانچویں بطلیموس کی جو اسکو اپنے جغرافیہ میں ۱۸۰۰۰۰ فرلانگ بتاتا ہے،

ان اعداد کی قدر و قیمت اسی حالت میں ہو سکتی ہے، جب کہ ہمیں فرلانگ کی پوری پوری پیمائش

کا پتہ ہو، لیکن یہ بہت مشکل بات ہے تاہم یہ لازمی امر ہے، کہ ہم ارسطو اور ارشمیدس کی بیان کردہ پیمائش میں یونانی فرلانگ کا حساب کریں، جو ۴۸۰ فٹ یا ۱۸۵ میٹر کے برابر ہوتا ہے، چنانچہ یہ پیمائش ۴۰۰۰۰، یا ۵۵۵۰۰ کیلو میٹر کے برابر ہوتی ہے، اراٹوستینس کے مطابق ایک فرلانگ ۳۰۰ مصری شاہی کیوبٹ (ذراع) کے برابر ہے یا ۱۵۷ میٹر کے برابر، اس سے زمین کا دائرہ ۳۹۶۹۰ کیلو میٹر ہوا، بطلیموس کے مطابق فرلانگ مصری ۴۰۰ شاہی کیوبٹ یا ۲۱۰ میٹر ہوا، اور پوسی ڈونی کا ناپ اراٹوستینس کے ناپ سے ملتا ہے، چنانچہ ان دونوں کا اندازہ یکساں ہی یعنی ۳۷،۸۰۰ کیلو میٹر،

ہم دیکھتے ہیں، کہ آخری تین پیمائشیں اور بالخصوص اراٹوستینس کی پیمائش ہمارے موجودہ چالیس ہزار کیلو میٹر کے اندازے کے بہت قریب ہی، یہ پیمائش محض اتفاقی نہ تھی، بلکہ اس ذہانت کا نتیجہ تھی، جس کی مدد سے اُس نے قدیم آلات مشاہدہ کا استعمال کیا، وہ طریق مشاہدہ یہ تھا، کہ ایک ہی خط نصف النہار میں دو مختلف مقاموں پر دھوپ گھڑی کے راس السرطان اور راس الجدی کے سایہ کو دیکھا جاتا، اک سایہ سے ان دونوں جگہوں کے زاویہ راس کا پتہ چل جاتا یعنی قوس کی پیمائش معلوم ہو جاتی، خلیفہ مامون نے کرۂ ارض کے دائرے کی پیمائش کے لئے علما کے ایک گروہ کو جمع کیا، اور انھیں حکم دیا، کہ خط نصف النہار کے درجے کی پیمائش کریں، یہ لوگ جو طریق کار عمل میں لائے، وہ قدیم طریق سے مختلف تھا،

یہ تمام علما ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے، اور اسکے بعد اپنے آپ کو دو گروہوں میں تقسیم کر لیا ایک نے شمال کی طرف قطب کا رُخ کیا، یہاں تک کہ وہ ایک درجے کی بلندی پر آگئے، دوسرا گروہ جنوب کی طرف چلا حتیٰ کہ شمالی قطب ایک درجہ نیچے ہو گیا، اس کے بعد انھوں نے طے کردہ فاصلے کی پیمائش کی، اور پھر واپس آکر ایک جگہ جمع ہوئے، اور اپنی پیمائشوں کا مقابلہ کیا، ایک نے ۵۶⅔ میل کی مسافت طے کی تھی، اور دوسرے نے ۵۶ میل کی، پہلے انھوں نے ان دونوں فاصلوں کا اوسط نکالا، اس کے بعد مستقل طور پر بڑی پیمائش یعنی ۵۶⅔ کو لے لیا، زیر بحث میل کی لمبائی چار ہزار ذراع

تھی، ہر ذراع ۲ تھی، پس سارے دائرہ کا اندازہ ۴۰،۲۲۵ کیلو میٹر ہوا،

چونکہ اس طریق پیمایش کا ذکر بہ تکرار آتا ہے، اسلئے معلوم ہوتا ہے، کہ اس عمل کو بار بار دہرایا گیا ہوگا، مسعودی بھی وادی سنجار میں ایک پیمایش کا ذکر کرتا ہے، جو کوفہ اور مدینۃ السلام کے درمیان تھی، اور دوسری طلیرہ اور رقہ کے درمیان ابن یونس ایک اور پیمایش کا ذکر کرتا ہے جو فرات کی ریگستانی وادی میں طلیرہ اور وامیہ کے درمیان کی گئی، دائرے کے ایک درجے کی مسافت کو ۶۵⅔ میل مقرر کرلینے کی وجہ محض نظری تھی، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یاقوت دوسرے ثقہ مصنفوں کے قول کی بنا پر بیان کرتا ہے کہ یہ فاصلہ ۲۵ فرسنگ تھا اور فرسنگ کو تین میل سمجھتا ہے، اور بیبی ایک درجہ کا فاصلہ ۲۵ لیگ خیال کرتا ہے، ایک لیگ ۱۲،۰۰۰ ذراع کا ہوتا ہے،

البیرونی نے اپنی کتاب میں جو استعمال اصطرلاب پر ہے، دائرہ نصف النہار کے قوس کی پیمایش کا ایک نہایت عمدہ طریقہ بتایا ہے، یہ طریقہ اس نے خود دریافت کیا تھا، وہ یہ ہے کہ ایک شخص صاف چٹیل میدان میں یا سمندر کے کنارے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو جائے، اور وہاں اصطرلاب کے ذریعے غروب آفتاب کے مقام کو مدنظر رکھے، جہاں سورج غروب ہو، وہاں سے متوازی خط کے ساتھ زاویہ انخفاض (angle of depression) کا اندازہ کرے، پھر ٹیلے کی بلندی دریافت کرکے نصف قطر دریافت کرے اور پھر نصف قطر کو چھ سے ضرب دیکر دائرہ کی پیمایش نکل آئے گی،

سمت قبلہ کی دریافت، مسلمانوں میں تسخیر عالم کا شوق اور حج کعبہ کی تقدیس و عظمت دو زبردست محرکات ہوئے ہیں، جن کے باعث ان میں علم جغرافیہ نے خاص مقبولیت حاصل کرلی تھی، علاوہ بریں اس علم کے قبول عام کی ایک اور بھی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان نماز قبلہ رخ ہو کر پڑھتے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبلہ کی سمت کیسے دریافت کی جائے، شہروں میں تو وہاں کے اصحاب علم و فضل، جغرافیہ نگار، اور ہیئت دان اس امر کا فیصلہ کرسکتے ہیں، ساتھ ہی مسجد کی محرابیں، اس سمت خاص کا پتہ دیتی ہیں، لیکن جب ایک مسافر کسی جنگل یا صحرا میں تنہا جا رہا ہو اور قبلہ کی سمت دریافت کرنی ہو، تو اسکے لئے چارہ کار کیا ہوگا، ؟ اسکے لئے امام غزالی

اپنی تصنیف احیاء العلوم میں تین چیزیں پیش کرتے ہیں، اول کیفیات ارضی، دوسرے علم کائنات الجو اور تیسرے ستارے، زمین کے حالات کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی بلند پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا جائے کہ فلان حدود کے اندر یہ چوٹی کعبے کے کس طرف واقع ہے، اور اس کے مطابق قبلہ کی طرف رخ کیا جائے، دوسرے جنوبی اور شمالی ہواؤں کا رخ دیکھکر صحیح سمت دریافت کرلیجائے، تیسرے ستاروں کو دیکھ کر معلوم کرلیا جائے کہ قبلہ کس طرف ہے، اور اگر دن کا وقت ہو، تو سفر سے پہلے اپنے علاقے میں سورج کے طلوع و غروب کے مقام ذہن نشین کرلیئے جائیں، اور اسی نسبت سے یہ اندازہ کرلیا جائے، کہ قبلہ کس طرف کو ہے، یعنی بائیں جانب ہے، یا دائیں جانب، یا کسی اور جانب، یہ چیز مکے کے شمال میں رہنے والوں کے لئے ہے، اسی قسم کے مشاہدات ہر نماز کے وقت دہرانے پڑتے ہیں، اب ایک بات اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ سورج کی گردش کا رخ موسم کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے، چنانچہ اس تغیر کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے،

غروب آفتاب کے بعد قطب ستارے سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتا، یہ اندازہ کرکے کہ قطب ستارے کا رخ کیا ہے، قبلہ کی سمت دریافت کرلیجاتی ہے،

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مشاہدات صرف اسی حالت میں ضروری ہیں، جب کہ مسافت محدود ہو، ورنہ دور دراز سفر میں تو مختلف شہروں میں سے گذرنے کے باعث ہر جگہ مسجدیں نظر آتی ہونگی، اگرچہ ان مشاہدات کی کوئی علمی حیثیت نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ عوام میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی، کہ مشاہدہ کیا شے ہے، اور ستاروں اور مختلف مقامات کے جغرافی حالات میں کیا تعلق ہے، ؟

تلخیص و تبصرہ

اسلامک آرٹ پر پولش مطبوعات

اس عنوان سے پولینڈ کے ایک محقق ٹاڈیوز مان کوسکی (Tadeusz Mankowski) کا ایک فاضلانہ مقالہ رسالہ آرس اسلامیکا جلد سوم حصۂ اول میں شائع ہوا ہے، جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

پولینڈ میں اسلامک آرٹ کے اثرات کوئی بہت طویل مدت سے نہیں جاری ہیں، کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ ان اثرات کی ابتدا پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کی جنگوں سے ہوئی، اور میدان جنگ سے جو مال غنیمت پولینڈ میں آتا تھا، اُسی کو دیکھ کر مشرقی آرٹ کا ذوق اور ملکی مصنوعات میں اس آرٹ کی تقلید کا شوق پیدا ہوا، لیکن پرانے دفتری کاغذات کے مطالعہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ اس باب میں جنگوں سے بہت زیادہ دو باہمی تجارتی تعلقات اثر انداز ہوئے، جو صلح کے زمانوں میں دونوں ملکوں کے درمیان قائم رہتے تھے، ان تجارتی تعلقات کا سلسلہ قرونِ وسطیٰ تک پہنچتا ہے، اسی زمانے سے مشرقی مصنوعات پولینڈ میں آنے لگیں جن میں زیادہ تر قیمتی کپڑے، تلواریں، اور وہ تمام سامان ہوتے تھے، جو گھوڑے سے متعلق ہیں،

جن دفتروں میں یہ کاغذات محفوظ ہیں، ان کی تعداد بہت ہے، لیکن معلومات کے لحاظ سے ان کاغذات کا سب سے وافر ذخیرہ لواؤ (Lwow) میں ہے، جس سے پولینڈ پر اسلامی

آرٹ کے اثر سے متعلق نہایت اہم تفصیلات حاصل ہوتی ہیں، ترک ایرانی، یونانی، اور آرمینی تاجر جو مشرق سے آیا کرتے تھے، اپنے قضیوں میں جو ملکی باشندوں سے یا خود آپس ہی میں پیش آجاتے تھے، لواؤ کی قانونی عدالتوں سے چارہ جوئی کرتے تھے، چنانچہ لواؤ کے عدالتی دفتروں میں چودھویں صدی کے آخر سے ایسے کاغذات ملتے ہیں، جن سے نہ صرف ان تجارتی راستوں پر روشنی پڑتی ہے، جن سے مالِ تجارت کریمیا کی جینوی نوآبادی کافہ سے لواؤ اور پولینڈ کے دوسرے علاقوں سے ہوتا ہوا مغرب لیجایا جاتا تھا، بلکہ ان صنعتوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جن کی مختلف چیزیں اس راستہ سے مشرق سے آیا کرتی تھیں اسی طرح فلانڈرس (Flanders) سے کپڑے اور بحر بالٹک کے ساحلی ملکوں سے کاہ ربا کی بنی ہوئی چیزیں لواؤ سے ہو کر مشرق کو جایا کرتی تھیں،

لواؤ اور کمینیک پوڈولسکی (Kamieniec Podolski) کے پرانے کاغذات سے اس تجارت کے مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں، باسفورس اور جزیرہ نمائے بلقان میں ترکوں کے قیام پذیر ہونے کے بعد بھی یہ تجارت بالکل بند نہ ہوئی، بلکہ صرف چند دنوں کے لئے موقوف ہو گئی، بہیم جنگوں کے باوجود پولینڈ اور اسلامی ملکوں کے تجارتی اور صنعتی تعلقات بڑھتے ہی گئے، ان تعلقات کو تقویت دینے میں آرمینیوں نے خاص حصہ لیا، جنھوں نے پولینڈ کے جنوبی مشرقی شہروں میں متعدد نوآبادیاں قائم کر لی تھیں، آرمینیوں کے عدالتی کاغذات سے پولینڈ کے ان سرحدی شہروں کی صناعیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں، ان کاغذات سے ایشیا سے کوچک اور ایران کے دور دراز شہروں کی صنعتی زندگی کا بھی پتہ لگتا ہے، جہاں سے تاجر اپنا مال لیکر لواؤ اور کمینیک پوڈولسکی کے میلوں میں آیا کرتے تھے،

ان عدالتی قلمی دستاویزات کے علاوہ جو مطبوعات ہیں، وہ بھی اسی قدر اہم ہیں، لیکن ان سب میں ایسے معلومات نہیں ہیں، جو آرٹ کے مورخ کے لئے اہمیت رکھتے ہوں، علاوہ بریں یہ مطبوعات

سولہویں صدی سے قبل نہیں ملتیں، اس صدی کا وہ سفرنامہ دیکھنے کے قابل ہے، جو مارسین برونیوسکی (Marcin Broniewski) نے تاتار کے دو سفروں کے حالات میں لکھا تھا، اس میں کریمیا اور پولینڈ کے درمیان تجارتی راستوں کے حالات ملتے ہیں، جن سے مشرقی سامان خصوصاً زربفت وغیرہ پولینڈ لایا جاتا تھا،

سترہویں صدی کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم سیفر موراٹووکز (Sefer Muratowicz) کا سفرنامہ ایران ہے، جہاں وہ ۱۶۰۲ء میں شاہ سگمنٹ سوم (Zygmunt III) کی طرف بھیجا گیا تھا، یہ سفرنامہ ۱۷۷۷ء میں وارسا میں طبع ہو کر شائع ہوا، اوس کا دوسرا اڈیشن [illegible] میں نکلا، اس سفرنامہ میں موراٹووکز نے ایران اور خصوصاً اصفہان اور کاشان کے حالات بیان کئے ہیں، جہاں اس کا قیام زیادہ تر رہا، کاشان میں شاہ عباس اوّل کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے جو معلومات اس نے تحریر کئے ہیں، وہ بہت اہم ہیں، انہی کارخانوں میں موراٹووکز نے شاہ پولینڈ کے لئے قالین بنوائے تھے، اور اون کو بنتے ہوئے خود بھی دیکھا تھا، یہ قالین ابھی تک موجود ہیں، اور ان سے ایران کی اس صنعت کی تاریخ معلوم کرنے میں بہت کچھ مدد ملتی ہے،

سیمین (Simeon) آرمینی کا سفرنامہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، یہ آرمینی زبان میں ایک قلمی نسخہ سے شائع کر دیا گیا ہے، جو لواؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے، سیمین ۱۶۰۵ء میں لواؤ سے روانہ ہوا، اور ۱۶۱۵ء تک ایشیائے کوچک، فلسطین اور مصر میں چار بار سفر کیا، اوس نے بعض شہروں کے فنِ تعمیر سے متعلق جو مفصل حالات تحریر کئے ہیں، وہ آرٹ کے مورخ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں،

فادر تاڈیوز کروسنسکی (Father Tadeuz Krusinski) نے بھی جو ایک

جیسوئٹ مشنری تھا، اور لواؤ میں پیدا ہوا تھا، اپنا سفرنامہ لکھا ہے، لیکن اوس نے خصوصیت کے ساتھ ایران کے حالات بیان کئے ہیں، جہاں اس کا قیام ۱۷۱۱ء سے ۱۷۲۶ء تک تھا، اس نے ایران سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں، لیکن آرٹ کے مورخ کے لئے اسکی سب سے زیادہ اہم کتاب "آخری جنگ ایران کا المیہ" (Tragedy of the last Persian war) ہے، جو متعدد زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں شاہ عباس اوّل کے عہد کے پارچہ بافی کے تمام شاہی کارخانوں کے مفصل حالات درج ہیں، نیز اون تمام مقامات کی تصریح ہے، جہاں یہ کارخانے قائم تھے، ایرانی قالین، زربفت اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی تجارت کے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور چونکہ تمام معلومات مصنف نے ذاتی تحقیق کی بنا پر فراہم کئے ہیں، اسلئے یہ کتاب غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے،

نیکوروکز (Nikorowicz) کی تجارتی کوٹھی کے کاغذات سے بھی جو ۱۷۵۲ء سے ۱۷۷۴ء تک کے کاروبار سے متعلق ہیں، کافی مواد ملتا ہے، بیجک سے معلوم ہوتا ہے، کہ زربفت اور دوسرے قیمتی کپڑے اور تلواریں استنبول سے پولینڈ لا کر لواؤ میں فروخت کی جاتی تھیں، اس کوٹھی کے مالک دو آرمینی باپ بیٹے تھے، جو لواؤ میں آباد ہو گئے تھے، لیکن وہ باری باری استنبول میں بھی رہتے تھے، جس قلمی نسخہ میں مال تجارت کی فہرست اور بیجک وغیرہ درج ہیں، وہ لواؤ میں کاؤنٹ زیڈیوزاکی (Dzieduszycki) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے، مال کی فہرستوں کے علاوہ کہیں کہیں زربفت وغیرہ کے متعلق بیانات اور انکے مختلف نام بھی ملتے ہیں، نیز استنبول کے ان کارخانوں کا ذکر بھی آتا ہے، جہاں یہ کپڑے بنے جاتے تھے، ان کاغذات سے اس زمانہ کی پارچہ بافی کی صنعت اور خصوصاً ان مشرقی چادروں کی بابت معلومات حاصل ہوتے ہیں، جو ایک کثیر تعداد میں ترکی دار السلطنت سے پولینڈ میں لائی جاتی تھیں، اس کوٹھی کے کاغذات کے علاوہ، دوسرے تجارتی بہی کھاتوں، سامان جہیز کی فہرستوں، اور امرائے پولینڈ کے متروکات

کے تقسیم ناموں سے بھی مشرقی قالینوں، چادروں، مختلف قیمتی کپڑوں، اور مرصع تلواروں کے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، یہ پولینڈ، ترکی اور ایران کی تجارت کی خاص چیزیں تھیں، اور سترھوین اور اٹھارھویں صدی میں پولینڈ میں ان کا رواج کثرت سے تھا،

انہی معلومات نیز مشرقی طرز کی چیزوں کے متعدد پولش ذخیروں پر پولینڈ کے ان معدودے چند مورخین نے جنھوں نے ان مسائل پر توجہ کی ہے، اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے، انھوں نے سب سے زیادہ کوشش کلچر اور آرٹ کے اُن تعلقات کو دریافت کرنے میں صرف کی ہے، جو کسی زمانہ میں پولینڈ اور اسکی جنوبی مشرقی سرحد سے متصل ترکی علاقوں، اور پھر بعد میں ایران کے ساتھ قائم تھے، حال تک پولینڈ کے طلبائے آرٹ اسلامک آرٹ کی تحقیق میں صرف اوسی حد تک حصہ لیتے تھے، جس حد تک اوس کا تعلق پولینڈ سے تھا،

اسلامک آرٹ کی تحقیق اوّل اوّل ولاڈسلا لوزنسکی (Wladyslaw Lozinski) نے شروع کی، جس نے اپنی کتاب "لواؤ کے امرا اور عوام سولھویں اور سترھویں صدی میں،" (Patriciate and Commonality of the Citizens in Lwow during the XVI and XVII Century) میں یہ دکھایا ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان آرٹ کے تبادلہ میں لواؤ نے کس قدر حصہ لیا، اور بتایا ہے، کہ لواؤ ہی نے اسلامک آرٹ کو پولینڈ کے تمام وسیع علاقوں میں پھیلایا، اپنی دوسری کتاب "لواؤ میں سونے اور چاندی کی چیزیں" (Gold and Silver in Lwow) میں لوزنسکی دکھاتا ہے، کہ لواؤ میں زرگری کی صنعت پر اسلامک آرٹ کا کسقدر زیادہ اثر پڑا، یہ اثر آرمنی زرگروں کا رہین منت تھا، لوزنسکی اسپر اپنی ایک اور کتاب "لواؤ میں صنعت زرگری کا آرمنی خاتمہ" (Armenian Epilogue to the Gold Smith's Art in Lwow) میں بھی بحث کرتا ہے،

مشرقی آرٹ کے مسئلہ کا مطالعہ سب سے پہلے لوزنسکی ہی نے کیا، وہی پہلا شخص ہے، جس نے اسلامک آرٹ کے اثر کی سائنٹفک تحقیق کی، اور اون مصنوعات کی طرف توجہ دلائی، جن میں مشرقی اور مغربی آرٹ کے عناصر باہم ملے ہوئے نظر آتے ہیں، لوزنسکی سے قبل جو کتابیں لکھی جاچکی تھیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- "قدیم پولینڈ کی صنعت وحرفت" (Information Concerning Industry and Art in old Poland)

۲- "پولینڈ کی چادریں ان کے کارخانے اور ان کے نشانات" (Polish Scarfs their weaving-workshops, and their marks)

۳- "سلک میں راڈزیولز کا چادروں کا کارخانہ" (The Weaving-work-Shop of Scarfs of the Radziwills in Sluck)

ان کتابوں سے پولینڈ کی قدیم پارچہ بافی کی صنعت کے متعلق بہت زیادہ معلومات حاصل ہوئے لیکن ان میں اسلامک آرٹ کے اثر کا جو نمایاں طور پر اس صنعت پر پڑا کوئی ذکر نہیں تھا،

مقالہ نگار نے خود بھی اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اُسے مندرجۂ ذیل رپورٹوں اور کتابوں میں شائع کر دیا ہے:-

۱- "مشرق ومغرب اور سترھویں صدی میں پولینڈ کی صنعت پارچہ بافی" (East and west in the Polish weaving Industry of the XVIIth Century)

یہ رپورٹ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں اہل پولینڈ کے انقلاب ذوق کو دکھایا گیا ہے، جب اونھوں نے پارچہ بافی کی صنعت میں اطالوی نمونوں کو ترک کرکے اسلامک آرٹ کی تقلید شروع کی،

۲- دوسری رپورٹ میں جو ۱۹۲۳ء میں "مشرقی چادریں اور پولش چادریں" (Easter n...

کے عنوان سے شائع ہوئی، کسی حد تک براہ راست اسلامک آرٹ سے بحث کی گئی ہے اور ان چادروں کا ذکر ہے جو اٹھارہویں صدی میں پولینڈ بھیجنے کے لیے استنبول میں تیار کیجاتی تھیں، نیز اس اثر کو بیان کیا ہے، جو مشرقی چادروں نے پولش چادروں کی صنعت پر ڈالا،

۳- تیسری رپورٹ "لواؤ کی دستکاری" (Lwow Manufacture) کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں لواؤ کی سوسائٹی آف سائنس کے سامنے پیش کی گئی، اس میں دکھایا گیا ہے کہ سترہویں صدی میں لواؤ نے تلوار اور گھوڑے کے ساز و سامان کی صنعت میں کس قدر حصہ لیا، اور اس صنعت پر اسلامک آرٹ کا کہاں تک اثر پڑا،

۴- پولش اکاڈمی آف سائنس کے سامنے جو رپورٹ ۱۹۳۴ء میں پیش کی گئی، اس میں بتایا گیا ہے، کہ سترہویں صدی میں منقش اور زرتار کپڑوں کی صنعت پر اسلامک آرٹ کا کتنا اثر پڑا،

۵- آخری تصنیف "لواؤ میں اہل آرمینیا کا آرٹ" (Arts of the Armenians in Lwow) ہے، جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، اس میں دکھایا گیا ہے، کہ پولینڈ میں اسلامی آرٹ کے پھیلانے میں آرمینیوں نے کتنا حصہ لیا،

مذکورۂ بالا رپورٹوں کو یکجا کرکے، اور ان میں چند مزید ابواب کا اضافہ کرکے ایک مستقل کتاب شائع کردی گئی ہے، جس کا عنوان ہے "سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں پولینڈ کا اسلامک آرٹ"، (Islamic Art in Poland during the XVII and XVIII Centuries) پولینڈ میں اسلامک آرٹ کے اثر پر جتنی تحقیق کی جاسکتی تھی، وہ سب اس کتاب میں جمع کردی گئی ہے،

ان تمام کتابوں میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اسلامک آرٹ سے صرف اسی حد تک بحث کی گئی ہے، جس حد تک اس کا اثر پولینڈ پر پڑا، لیکن ان کے علاوہ پولینڈ میں ایسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں،

جن کا موضوع بجائے خود اسلامک آرٹ ہی ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے:- "مسلمان ولیوں کی تصویریں اور ایران کی مصوری پر رومن کیتھولک اثرات" (Pictures of Moslem Saints and the Iconographic Roman Catholic Influences in Persia) اس کتاب میں دکھایا گیا ہے، کہ ایرانی مذہبی آرٹ کے رجحانات کیا تھے، رومن کیتھولک آرٹ کا اُس پر کسقدر اثر پڑا، مصوری میں یوروپین نمونوں سے ایرانیوں نے کہاں تک اخذ کیا، اور سولھویں صدی کے بعد سے ایران اور پولینڈ کے باہمی تعلقات نے ایرانی آرٹ پر کتنا اثر ڈالا،

ایرانی آرٹ سے متعلق ایک پولش مصنف اسٹیفن کومورنِکی (Stefan Komornicki) کی کتاب فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہوئی ہے، جو اپنے معلومات کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس میں پندرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کے ان مخطوطات کی تصویریں بھی نقل کی گئی ہیں، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں،

محققین پولینڈ نے نہ صرف ان اثرات کی تحقیق کی ہے، جو اسلامک آرٹ سے پولینڈ کی صنعتوں پر پڑے، بلکہ خود اسلامک آرٹ سے متعلق بھی خواہ وہ ترکی، ایران، یا کسی دوسرے اسلامی ملک کا ہو، بہتیرے اہم مسائل اپنی تلاش و تحقیق سے حل کردیئے ہیں،

"ع ز"

تاریخ صقلیہ جلد دوم

اس میں سسلی کے عہد اسلامی کے تمدنی جغرافیہ، نظامِ حکومت، زراعت، صنعت، حرفت، تعمیر و تجارت، تہذیب و معاشرت، اور علوم و فنون کا تفصیلی مرقع دکھا کر، یورپ پر سسلی کے اسلامی تمدن کے اثرات دکھائے گئے ہیں

ضخامت ۵۰۰، قیمت:- للعہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

قدیم رومن کتب خانے

سیزر کے قتل اور خانہ جنگیوں کے بعد جب شہنشاہ اکٹیوین (Octavian) تخت نشین ہوا تو سلطنت روما کو نصف صدی امن اور خوشحالی کی نصیب ہوئی، یہی زمانہ لاطینی لٹریچر کا عہد زریں خیال کیا جاتا ہے، کتابوں کا شوق اسقدر بڑھا کہ کتب خانہ گھروں کا ایک ضروری جزو بن گیا، ان کتب خانوں کا رُخ عموماً مشرق کی طرف ہوتا تھا، تاکہ صبح کی روشنی پہنچ سکے، اور کتابیں آفتاب کی تمازت سے محفوظ رہیں، گھروں میں کتب خانہ کے لئے جو کمرہ مخصوص ہوتا، وہ عموماً چھوٹا ہوتا تھا، اتنا چھوٹا کہ کہیں کہیں آدمی ہاتھ پھیلا کر دونوں طرف کی دیواریں چھو سکتا تھا، لوگ کتابیں نکال کر دوسرے کمرہ میں لیجا کر پڑھتے تھے، جہاں کوچیں پڑی رہتی تھیں، کتب خانہ میں صرف کتابیں رہتی تھیں، بیٹھنے کا کوئی سامان نہ ہوتا، کمروں میں پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے کا رواج عام تھا،

پبلک لائبریری زیادہ کشادہ ہوتی تھی، اس میں مشہور آدمیوں کی تصویریں آویزاں ہوتیں، بعد میں لوگ اپنے ذاتی کتب خانوں کو بھی اسی طرح آراستہ کرنے لگے، علوم وفنون کی رومن دیویوں کے مجسمے بھی عموماً نصب ہوتے تھے،

کتب خانوں سے تعلق رکھنے والوں کا ایک طبقہ ہی الگ تھا، اسمیں آزاد، آزاد شدہ غلام اور غلام تینوں قسم کے لوگ شامل تھے، ان کے سپرد مختلف خدمتیں تھیں، کچھ لوگوں کے متعلق خطوط لکھنا، سکریٹری کا

کام انجام دینا، اور حساب کتاب رکھنا تھا، کچھ کتابیں لکھتے یا ان کی نقلیں کرتے تھے، بعضوں کے سپرد یہ کام تھا کہ الماریوں سے کتابیں نکال کر لوگوں کو دیں، اور ان کو صاف ستھرا رکھیں، یہ لوگ جلد بندی بھی کرتے تھے،

کتابوں کے لکھنے کے لئے جو کاغذ استعمال ہوتا تھا، وہ ایک قسم کی مصری نے کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جسکو پپائرس (Papyrus) کہتے تھے، اسی سے انگریزی لفظ پیپر (کاغذ) نکلا ہے، لیکن خود اس چھال کا لاطینی نام لائبر (Liber) ہے، جو ماخذ ہے کتابوں سے متعلق بہت سے الفاظ کا، جب مصری نے کی کاشت کے بند ہو جانے سے مصر سے اس کاغذ کی درآمد رک گئی، تو پرگامم (Pergamum) کے لوگوں نے جو سلطنت رومہ کی ایک مد مقابل مملکت تھی، بھیڑ اور بچھڑوں کی کھالوں سے کاغذ بنانا شروع کیا، یہ کاغذ رومہ میں بہت مقبول ہوا، اسے رومن پرگامنطم (Pergamentum) کہتے تھے، یہ نام مسخ ہو کر آج بھی پارچمنٹ (Parchment) کی شکل میں موجود ہے،

کتابیں سُرخ اور سیاہ دونوں قسم کی روشنائی سے لکھی جاتی تھیں، رومن قلمدانوں میں سیاہ اور سرخ روشنائی کے لئے علٰحدہ علٰحدہ دواتین ہوتی تھیں، انکے نمونے برٹش میوزیم میں موجود ہیں، قلم نے کے ہوتے تھے،

اہل رومہ کی خوشحالی کے ساتھ پبلک اور پرائیوٹ کتبخانے بھی وسعت اور تعداد میں بڑھتے گئے اور کتابوں کی مانگ نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا، جس نے کتب فروشی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا، کتب فروشوں کی دوکانیں اکثر رومہ کے مرکزی حصہ میں واقع تھیں، دوکاندار کتابوں کے اشتہارات اپنی دوکانوں کے در و دیوار پر چسپاں کر دیتے تھے، نئے اڈیشنوں کے خریدار بہت کثرت سے آتے تھے، قیمتیں بھی کچھ بہت گراں نہ تھیں،

جراحی کی کرامتیں

یورپ اور امریکہ میں فن جراحی (سرجری) کو جو حیرت انگیز ترقی دی جارہی ہے، وہ اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ چہرہ کی خلقی بدصورتی بھی آپریشن کے ذریعہ دور کر دی جاتی ہے، اور بدصورت سے خوبصورت

آدمی بھی ہسپتال سے نکلنے کے بعد اچھا خاصا شکیل معلوم ہونے لگتا ہے، اس فن نے اب سے صدیوں قبل بھی بہت کچھ ترقی کر لی تھی، چنانچہ بارہ سو برس ہوئے، جب شہنشاہ جسٹنین ثانی (Justinian II) کی ناک میدان جنگ میں جاتی رہی، تو اس کے جراحوں نے اسے ازسرنو درست کر دیا تھا، اور چہرہ کی بدنمائی بالکل رفع ہو گئی تھی، سولھویں صدی میں بھی ایک مشہور اطالوی ڈاکٹر تاگلیا کوزی (Tagliacozzi) نے بعض ایسی حیرت انگیز ایجادیں کی تھیں، جو آج تک مستعمل ہیں، کٹی ہوئی ناک کو درست کرنے کے لئے یہ ڈاکٹر ایک خاص طریقہ سے مریض کا ہاتھ اس کی ناک پر باندھ دیتا تھا، کچھ دنوں کے بعد گوشت اور جلد ہاتھ سے منتقل ہو کر ناک پر آجاتی تھی، لیکن اس فن میں جو ترقی آج رونما ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی، یورپ اور امریکہ میں ایسے ہسپتال کثرت سے کھل رہے ہیں، جن میں خلقی بدصورتی یا وہ بدنمائی جو کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہو، دور کر دی جاتی ہے، چہرہ کی جھریاں یا عمر کی پختگی کے آثار جو چہرہ سے ظاہر ہوتے ہیں، مٹا دیئے جاتے ہیں، وہ عورتیں جو اپنی عمر سے زیادہ نو عمر بننا چاہتی ہیں، ان ہسپتالوں میں کثرت سے جاتی ہیں، مگر اس فن کے ماہر ڈاکٹروں کی تعداد ابھی بہت کم ہے، امریکہ کے ڈاکٹر میکسول مالٹز (Maxwell Maltz) نے اس پر حال میں ایک کتاب "نئے چہرے، نئے مستقبل" (New Faces — New Future) کے عنوان سے لکھی ہے، جس میں بتایا ہے کہ انگلستان میں ایسے ماہر ڈاکٹروں کی تعداد بارہ سے چودہ تک ہے، فرانس میں بھی اسی قدر، جرمنی میں دس یا بارہ، اٹلی میں چار، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں چالیس سے پچاس تک، عطائیوں کے آپریشن سے چہرہ بجائے درست ہونے کے اور زیادہ خراب ہو جاتا ہے، سب سے زیادہ عجیب بات جو ڈاکٹر موصوف نے لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ آپریشن سے نہ صرف چہرہ کی بدنمائی دور ہو جاتی ہے، بلکہ پوری زندگی کا رُخ ہی بدل جاتا ہے، اونھوں نے یہ نظریہ غلط ثابت کر دکھایا ہے، کہ انسان کے چہرہ سے اُس

کی سیرت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، اون کے نزدیک چہرہ کے نقشہ اور سیرت کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں،

درازی عمر کا مسئلہ

کورنل یونیورسٹی امریکہ کے تین ڈاکٹر مینارڈ، میکے اور آسڈل (Maynard, Mecay and Asdell) پانچ سال سے درازی عمر کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، انھوں نے اپنے تجربات کے لئے سفید چوہوں کو منتخب کیا ہے، جو عموماً انسانوں ہی کی سی غذا کھاتے ہیں، سفید چوہا دس روز میں اپنی مدت حیات سے اسی قدر صرف کرتا ہے، جسقدر انسان ایک سال میں صرف کرتا ہے، لہذا جب کہ انسان پر تمام عمر میں صرف ایک بار تجربہ کیا جا سکتا ہے، اُسی مدت میں چوہوں کی پندرہ پشتوں کا یکے بعد دیگرے مطالعہ ہو سکتا ہے، ان ڈاکٹروں نے اپنے پنج سالہ تجربہ کی بنا پر حال میں بیان کیا ہے، کہ چوہوں کو ایسی غذا دینے سے جس سے شروع میں اُن کی نشو و نما تیزی کے ساتھ نہ ہو سکے، ان کی مدت حیات زیادہ ہو جاتی ہے، اس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں، کہ مناسب غذا سے انسانی عمر میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن ابھی یقین کے ساتھ وہ اس خیال کا اظہار نہیں کرتے، اور چھ سال کے مزید تجربہ پر اس فیصلہ کو ملتوی کرتے ہیں،

لیکن ان ڈاکٹروں کی رائے کے بالکل خلاف کولمبیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ہنری شرمن، (Henry Sherman) کے تجربات ہیں، جو چوہوں پر تجربہ کرنے میں امریکہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، وہ اپنے معملوں میں ہمیشہ ہزار ڈیڑھ ہزار زندہ چوہے رکھتے ہیں، انھیں اپنے تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سادہ اور معمولی غذاؤں کے استعمال سے نشو و نما تیزی سے ہوتی ہے، اور چوہے زیادہ دنوں تک زندہ رہتے ہیں، تو توقع کیجاتی ہے کہ آیندہ چند سالوں میں امریکہ کے مختلف الخیال ڈاکٹر اس مسئلہ پر کوئی متفق علیہ فیصلہ صادر کر سکیں گے،

"ع ز"

مطبوعاتِ جدیدہ

محمد دی پرافٹ (Muhammad The Prophet) از جناب فضل کریم خانصاحب درانی بی اے، ایڈیٹر ٹروتھ ریوے روڈ، لاہور چھوٹی تقطیع، ضخامت ۱۶۰ صفحے قیمت ۱۰؍عار

اس مختصر سی کتاب میں فاضل مصنف نے آنحضرت صلعم کی حیاتِ اقدس پر پیغمبرِ عالم کی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے، اور بہت خوبی کیساتھ دکھایا ہے، کہ آپ صرف عرب ہی نہیں، بلکہ سارے عالم کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوئے تھے، آپ کی بعثت سے قبل نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا عقیدہ و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا تھی، دینِ حق کی جو تعلیم مختلف پیغمبروں نے وقتاً فوقتاً مختلف قوموں کو دی تھی، وہ فراموش کی جا چکی تھی، علاوہ بریں آپ سے پیشتر ہر پیغمبر کی تعلیم کسی خاص ملک یا قوم کیلئے مخصوص تھی، دنیا ایک ایسے ہادی کی منتظر تھی، جسکا پیغام تمام قوموں کی یکساں طور پر رہنمائی کر سکے، آپ کی تشریف آوری کا مقصد اسی ضرورت کو پورا کرنا تھا، اور آپ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اس کام کو بدرجۂ کمال انجام فرما کر تمام تشنگانِ اصلاح کو ہمیشہ کے لئے سیراب کر دیا،

مصنف نے ان واقعات کو جس اسلوب سے پیش کیا ہے، وہ مستحقِ ستائش ہے، لیکن موصوف نے بعض ایسے خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، جن سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو، مثلاً اہلِ عرب کی بت پرستی کوئی ایسی اہم چیز نہ تھی، جس کے لئے کسی پیغمبر کی بعثت ضروری ہوتی، (صفحہ ۱۶) کیونکہ بت پرستی محض ایک "بے ضرر حماقت" ہے، (ص ۱۲) ہم نہیں سمجھ سکتے کہ بت پرستی سے بڑھ کر جو شرک کی عملی صورت ہے، اور کونسی ضلالت ہے جسے دور کرنے کیلئے کسی پیغمبر کی ضرورت ہو سکتی ہے، اسی طرح مصنف کا یہ خیال بھی حیرت انگیز ہے، کہ اگر کسی قوم کی اخلاقی حالت درست ہے تو یومِ آخرت پر عقیدہ نہ رکھنے میں چنداں مضائقہ نہیں، (ص ۲۱) یہ خیالات غالباً اسی جدت طرازی کا ثبوت ہیں

جس کا دعویٰ مصنف نے دیباچہ میں کیا ہے، موصوف کے نزدیک آنحضرت صلعم کے سوانحِ حیات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں جنمیں صرف تفصیلات کی کمی اور زیادتی کا فرق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی "بے معنی تفصیلات" میں کھو کر رہ گئی ہے، یہ بھی فرمایا ہے کہ ابنِ ہشام کے بعد سے آج تک مسلمانوں نے اس باب میں مطلق کوئی ترقی نہیں کی، اور سب سے بڑھکر یہ دعویٰ ہے کہ قرآن مجید اور نبی کریم صلعم نے ہماری فلاح کا جو طریقہ بتایا ہے، اسے کوئی دوسرا مصنف آجتک بیان نہ کر سکا، اور باستثناء ایک اور اہلِ قلم کے مصنف ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے سالوں اس موضوع پر غور و فکر کیا ہے، اور اس طریقہ کو بیان کر سکتا ہے، (دیباچہ)

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے،

دی میسج آف اسلام (The Message of Islam) (پیغام اسلام) انگریزی، از جناب فضل کریم خانصاحب درانی، ایڈیٹر ٹروتھ، لاہور، چھوٹی تقطیع ضخامت ۹۰ صفحے قیمت ۸؍

یہ رسالہ تین مقالات کا مجموعہ ہے، جنمیں سے پہلا "پیغام اسلام" مصنف نے انجمنِ مذاہب کے اجلاس میں جو ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، بطور خطبہ کے پڑھا تھا، ان میں موصوف نے اسلام کی خوبیاں مدلل طریقہ سے بیان کر کے اچھوتوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی ہے، اور دکھایا ہے کہ توحید کا عقیدہ انسان کو کسقدر بلند درجہ پر پہنچا دیتا ہے، پھر اسلام کی یہ خصوصیت بھی واضح کر دی ہے کہ وہ نہ صرف خالق اور مخلوق کے تعلقات کو استوار کرتا ہے، بلکہ انسانوں کے باہمی تعلقات کی نگہداشت بھی کرتا ہے، اسکے بعد اسلامی مساوات اور اسلام کی عالمگیر اخوت کا موازنہ ہندو، سکھ، بودھ اور عیسائی مذاہب کی تنگ نظری سے کر کے اچھوتوں کو متنبہ کیا ہے، کہ انکی آزادی اور فلاح صرف اسلام ہی کے ذریعہ ممکن ہے، آخر میں ہندوستان کی آزادی پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے، کہ اس کا واحد اور آسان طریقہ یہی ہے، کہ ہندو قوم جس میں سکھ بھی شامل ہیں، اسلام کی حلقہ بگوش ہو جائے، یہ رسالہ اس قابل ہے، کہ غیر مسلموں میں اس کی اشاعت کثرت سے کی جائے،

اسلام اینڈ کرسچینٹی (Islam and Christianity) از جناب محمد امیر عالم

صاحب اورنٹیل پرنٹرس اینڈ پبلشرس، کلکتہ، چھوٹی تقطیع، ضخامت ۲۵۶ صفحے، قیمت عہ

یہ کتاب مسیحی تبلیغ کے جواب میں لکھی گئی ہے، مصنف نے مروجہ مسیحیت کے بنیادی عقائد کا تجزیہ کرکے ان کی کمزوری کو پوری طرح واضح کردیا ہے، اور دکھایا ہے کہ انہی عقاید کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں دین عیسوی کے پیرووں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، پھر اسلامی عقائد کو بیان کرکے ثابت کیا ہے، کہ یہی ایک مذہب ایسا ہے، جو عقل کی روشنی میں ترقی کرسکتا ہے، اور جس میں تہذیب و تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت بدرجۂ غایت موجود ہے، جو لوگ عیسائیوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا

رفارمس ان حیدرآباد (Administrative Reforms in Hyderabad)

از جناب فتح اللہ خانصاحب نیو حیدرآباد پریس، اسٹیشن روڈ، سکندرآباد دکن، ضخامت (۱۶۰) صفحے، قیمت ۱۱ ــ ے ر

یہ ایک مختصر تاریخ ہے، اُن تمام اصلاحات کی جو ریاست حیدرآباد کے پہلے فرمانروا نظام الملک آصف جاہ کے وقت سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ کے عہد تک حکومت کے مختلف شعبوں میں جاری کی گئی ہیں، اسے پڑھکر بیک نظر معلوم ہوجاتا ہے، کہ آصف جاہ نے حکومت میں کہاں تک امن قائم کیا، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کتنی کوششیں کیں، انگریزوں کو کیونکر کامیابی ہوئی، انگریزوں سے اتحاد کرنے میں حکومت کو کسقدر فائدہ یا نقصان پہنچا، سر سالار جنگ نے کیا اصلاحات جاری کیں، میر محبوب علی خاں مرحوم کا قانونچہ مبارک کیا تھا، جس سے رعایا کو ایک باضابطہ دستور حاصل ہوا، اور پھر موجودہ عہد میں وہ کونسی اصلاحات نافذ ہوئی ہیں، جن سے حکومت کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی نظر آرہی ہے، کتاب اگرچہ مختصر ہے، لیکن ضروری باتیں چھوٹنے نہیں پائیں، اور حکومت حیدرآباد سے متعلق کسی دوسری کتاب میں اتنے معلومات شاید یکجا نہ مل سکیں،

"ع ز"

دارالمصنفین کی ادبی کتابیں

شعر الہند حصۂ اول، جس میں قدما کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۴۵۵ صفحے، قیمت للعہ، از مولٰنا عبد السلام ندوی،

حصۂ دوم، جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۹ صفحے، قیمت:- للعہ

گل رعنا - اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۰ صفحے، قیمت:- صہ، از مولٰنا سید عبد الحئی صاحب مرحوم،

مکاتیب شبلیؒ، مولٰنا شبلی مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولٰنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم،

حصۂ اول - ضخامت ۳۴۹ صفحے، قیمت:- عہ ۱۲

حصۂ دوم، " ۲۶۱ " " عہ ۱۲

موازنۂ انیس و دبیر (از مولٰنا شبلیؒ) اردو کے مشہور باکمال شاعر میر انیس کی شاعری پر ریویو اور فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین مرثیوں کا انتخاب اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو میں اپنے فن میں یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت ۲۰۴ صفحے، قیمت: ے ر

کلیات شبلی اردو، مولٰنا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت:- عہ

افادات مہدی، ملک کے نامور انشاپرداز ہم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعۂ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت: بیے حجم ۳۷۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جس میں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے، ۲ر کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں، (از مولٰنا سید ریاست علی ندوی)